BUDC-132

کلاسیکی اردو غزل کا مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومینیٹیز

بلاک

2

درج ذیل شعراء کی غزل گوئی کی خصوصیات (حصہ اول)

بلاک 2 کا تعارف

اکائی 5
ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات 61

اکائی 6
میر تقی میر کی غزل گوئی کے بنیادی عناصر 81

اکائی 7
خواجہ میر درد کی غزل گوئی کی خصوصیات 99

اکائی 8
خواجہ حیدر علی آتش کی غزل گوئی کی خصوصیات 113

بلاک 2 کا تعارف

دوسرا بلاک، بلاک 2 اور بلاک 3 کلاسیکی اردو غزل کے نمائندہ شعراء کی غزل گوئی سے متعلق ہے مگر طوالت سے گریز کرتے ہوئے انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں 4 اکائیاں ہیں جس میں ولؔی دکنی، سراؔج اورنگ آبادی، میر تقی میؔر، خواجہ میر درؔد اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پانچویں اکائی ولؔی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات سے متعلق ہے جس میں ولؔی اور سراؔج کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کے کلام کے محاسن اور خصوصیات سے واقفیت کرائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دو، دو غزلوں کی تشریح بھی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی غزلوں کے موضوعات کیا ہیں اور ان کے برتنے کے طریقے کیا ہوتے ہیں۔

چھٹی اکائی میر تقی میؔر کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیے سے متعلق ہے جس میں میؔر کا تعارف اور ان کی شاعری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ دو عام فہم اور مشہور غزلوں کی تشریح بھی پیش کی گئی ہے۔

ساتویں اکائی خواجہ میر درؔد کی شاعری اور ان کی دو غزلوں کی تشریح پر محیط ہے جس میں درؔد کا سوانحی خاکہ اور ان کے عہد کے سیاسی و سماجی ماحول کا بھی ذکر ہے۔ اس اکائی میں ان کے شعری محاسن کو بیان کرتے ہوئے ان کی غزلوں کے امتیازات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ طالب علموں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

آٹھویں اکائی خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں آتشؔ کے کلام کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور معاصرین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مشہور غزلوں کی تشریح پیش کی گئی ہے۔

اکائی 5 ولؔی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد
5.2 تمہید
5.3 ولؔی دکنی کی غزل گوئی کی خصوصیات
5.3.1 متن کی تدریس
5.3.2 سراؔج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات
5.3.3 متن کی تدریس
5.4 آپ نے کیا سیکھا
5.5 اپنا امتحان خود لیجیے
5.6 سوالات کے جوابات
5.7 فرہنگ
5.8 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ولؔی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے۔
- ولؔی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی کے نمائندہ کلام کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے۔
- ولؔی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی کے کلام کی اردو شاعری میں قدر و قیمت متعین کریں گے۔
- ولؔی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی کے ہم عصر شعرا کے متعلق جانکاری حاصل کریں گے۔

5.2 تمہید

علوم جغرافیہ کے ماہرین ہندستان کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔شمالی ہند اور جنوبی ہند۔ اردو پیدا تو ہوئی شمالی ہند کے علاقے، دہلی اور نواح دہلی میں مگر اس کے ادب کا آغاز وارتقا جنوبی ہند میں ہوا جو نہ صرف دہلی سے ہزاروں میل دور تھا بلکہ جہاں کی زبان، تہذیب اور معاشرت بھی مختلف تھی۔ بہرحال جن سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تقاضوں کے تحت اردو شمالی ہند سے جنوبی ہند پہنچی اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

شمالی ہند کے حکمراں علاء الدین خلجی نے 1310ء تک سارے دکن کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کر دی اور بہتر انتظام و انصرام قائم رکھنے کے لیے سارے دکن کو سو۔سو مواضعات میں تقسیم کر کے انتظامی حلقے بنا دیئے اور ہر حلقے پر شمالی ہند

سے تعلق رکھنے والا اپنا ایک افسر مقرر کیا جو''امیر صدہ'' کہلاتا تھا اس طرح شمالی ہند کے بے شمار خاندان دکن میں آباد ہو گئے اور وہ شمالی ہند کی زبان بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

1327ء میں محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد (دیوگری) کو اپنا پایہ تخت بنایا اور دہلی کی ساری آبادی کو دولت آباد ہجرت کر جانے کا حکم صادر کر دیا۔ اتنی بڑی آبادی کے دکن پہنچنے پر اصحاب صدہ کے ذریعے اردو کے فروغ کے لئے جو زمین تیار ہوئی تھی اس میں اور برگ و بار آنے لگے۔

مزید یہ کہ اب دکن کی طرف صوفیا کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی، جو عوام میں دین کی تبلیغ کے لیے اس وقت کی بول چال کی زبان استعمال کرتے تھے۔ یہی کچھ سیاسی و تہذیبی وجوہات تھیں جن کے ذریعے بول چال کی زبان، جو بعد میں اردو کہلائی، جنوبی ہند پہنچی۔ اور شمال و جنوب کے لوگوں کے درمیان رابطے کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ثابت ہوئی کیوں کہ اس کے اندر دکنی زبانوں کو جذب کرنے کا مادہ بھی تھا۔ رفتہ رفتہ اس زبان اور اس کے ادب نے اتنا عروج حاصل کر لیا کہ اس میں ولؔی اور سراؔج جیسے شاعر پیدا ہوئے۔

5.3 ولؔی کی غزل گوئی کی خصوصیات

ولؔی ولی ہے سخن میں جہاں کے بیچ، اس کا دیوان دکن سے شمال کیا آیا کہ اردو غزل کی رگوں میں نیا خون دوڑ گیا، اسے نئی زندگی مل گئی، اس میں نیا نکھار اور نئی خوشبو پیدا ہو گئی۔ حاتؔم نے ''دیوان زادہ'' کے مقدمے میں لکھا:

''فارسی میں میرزا صاحب کی پیروی کرتا ہوں اور ریختہ میں ولؔی کو اپنا استاد مانتا ہوں۔''

اسی مضمون کو انھوں نے اپنے اس شعر میں بھی بیان کیا ہے ۔

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولؔی ولی ہے سخن میں جہاں کے بیچ

محمد حسین آزاؔد نے ایک جگہ لکھا:

''جب ان کا دیوان دہلی پہنچا تو اشتیاق ادب نے ہاتھوں پر لیا۔ قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت سے زبان نے پڑھا۔ گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت میں انھیں کے گیت گانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔ اس طرح اردو شاعری بالخصوص ترقی کے امکانات بہت روشن ہو گئے تھے۔'' آبرؔو کہتے ہیں ۔

آبرؔو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولؔی کا سخن قیامت ہے

میرؔ کا فرمانا بھی مستند ہے ۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

وؔلی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات

لیکن تمام تر جدید وسائل تحقیق کے ہاتھ آجانے کے باوجود ابھی تک نہ تو وؔلی کی تاریخ پیدائش کا صحیح تعین ہو سکا ہے نہ ان کے وطن کا اور نہ ہی ان کی تاریخ وفات اور مقام مدفن کا۔ محققین و ناقدین نے انھیں نہ اورنگ آباد کا رکھا نہ گجرات کا اور نہ دکن کا اور وؔلی پر کام کرنے والی آئندہ نسلوں کے لیے ایک بھول بھلیاں بنا دیا۔ یہاں تک کہ وؔلی کے نام پر بھی محققین و ناقدین متفق نہیں، کوئی ولی اللہ لکھتا ہے تو کوئی محمد ولی کو صحیح ٹھہراتا ہے، کوئی ولی محمد کو درست کہتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ سید ولی محمد ہی اصل ہے۔ غنیمت ہے کہ وؔلی سب میں مشترک ہے چنانچہ یہی مقبول خلائق ہو کر درست ٹھہرا۔

وؔلی کے وطن کے بارے میں بھی کچھ لوگوں کے فرمودات دیکھیں۔ قائم چاند پوری ''مخزن نکات'' میں انھیں گجراتی لکھتے ہیں۔ میر حسن بھی ''تذکرۂ شعرا'' میں انھیں گجراتی بتاتے ہیں۔ فتح علی گردیزی ''تذکرہ ریختہ گویاں'' میں وؔلی کو دکنی لکھتے ہیں۔ قدرت اللہ قاسم ''مجموعۂ نغز'' میں انھیں دکنی بتاتے ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق ''چمنستان شعرا'' میں وؔلی کو اورنگ آبادی کہتے ہیں۔ میرؔ بھی ''نکات الشعرا'' میں انھیں اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ وؔلی خود اپنے کو دکنی لکھتے ہیں۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

قدیم تو قدیم جدید محققین بھی اختلاف رائے کا شکار ہیں۔ ظہیر الدین مدنی گجراتی ثابت کرنے پر مصر ہیں تو اورنگ آباد کے ایک صاحب آغا مرزا بیگ اپنی تصنیف ''ولی اورنگ آبادی'' میں انھیں اورنگ آبادی ثابت کرتے نہیں تھکتے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کی رائے کچھ متوازن نظر آتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''وؔلی کے باپ دادا گجرات سے ہجرت کر گئے تھے...ولی گجرات سے تعلق رکھنے کے باوجود دکن میں آ کر دکنی ہو گئے۔'' مختصر یہ کہ وؔلی کا تعلق کہیں سے ہو، وہ اردو کے شاعر ہیں اور انھوں نے اردو کا وقار بلند کیا ہے۔

وؔلی کے وطن کی طرح ان کے سنہ وفات کے تعین میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ظہیر الدین مدنی نے اپنی تصنیف ''ولی گجراتی'' میں ایک طویل بحث کے بعد وؔلی کا سنہ وفات چار شعبان 1119ھ (1707ء) طے کیا ہے، لیکن جمیل جالبی اس سے متفق نہیں ہیں وہ مختلف قرائن سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وؔلی کی وفات 1720ء سے 1725ء کے درمیان ہوئی۔

بہر حال وؔلی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں یہ غزل کا دور تھا گو کہ دکنی شعرا دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کر رہے تھے مگر غزل سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ وؔلی نے بھی دوسری اصناف میں داد سخن دیا ہے مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ غزل میں ان کا خاص موضوع عشق اور متعلقات عشق ہے۔

وؔلی کی شاعری میں گرم جوشی کا سبب ان کی رگ و پے میں عشق کا اتر جانا ہے۔ انھوں نے شاعری کی منزلیں طے کرنے کے لیے عشق کو اپنا رہنما بنا لیا۔ وؔلی کے یہاں عشق برائے شعر گفتن نہیں بلکہ ایسا جذبہ صادق ہے جس کی ہر کیفیت سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ راہ عشق کی سختیوں اور پریشانیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔

گریہ و گرد علامت سوں وؔلی خانہ عشق کو تعمیر کیا

وؔلی نے عشق کی کیفیات کو اس دل فریبی کے ساتھ پیش کیا کہ اس میں نیا نکھار اور نئی تابانی آ گئی۔ انھوں نے اس میں

فارسی اور دکنی کے امتزاج سے ایسا آہنگ پیدا کیا ہے جو جمالیاتی انبساط سے لبریز ہے۔

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

اے ولؔی طرز عشق آساں نہیں   آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

ولؔی سے پہلے دکنی روایت میں غزل کا تصور اس کے لغوی معنی، یعنی عورتوں سے باتیں کرنا یا ان کے بارے میں باتیں کرنا، تک محدود تھا اس میں کسی گہرے تجربے یا حقیقی جذبات واحساسات کا پتہ نہیں چلتا۔ ولؔی نے اس روایت کو اپنایا تو مگر اس میں زندگی کے رنگا رنگ تجربات، داخلی جذبات واحساسات اور واردات قلبیہ داخل کر کے اسے ایسی صنف بنادیا جس میں زندگی کے ہر رنگ اور ہر تجربات کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی اور زندگی کے چھوٹے بڑے تمام تجربات اس کے دامن میں سمٹ آئے۔ جتنے مضامین اردو غزل سے وابستہ ہیں وہ سب ولؔی کے یہاں ملتے ہیں۔

غزل میں محبوب کا سراپا بیان کرنا ایک عام موضوع تھا، ولؔی نے بھی اسے برتا لیکن ان کے مزاج کی سنجیدگی، شائستگی اور لطافت شیوۂ عشق کو قائم رکھتے ہوئے حسن کو رسوا نہیں ہونے دیتی۔

ولؔی کے عشق میں لذت کوشی ہے اور نہ بوالہوسی ان کے تصور عشق میں پاکیزگی کا احساس ہے۔ ان کے یہاں وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔ ولؔی نے عشق مجازی کے تمام پہلوؤں کو برتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

در وادیٔ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے
اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

اور جب وہ وادیٔ عشق میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے تو تصوف کی روایت کے تمام موضوعات اپنی غزلوں میں سمیٹ لیتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے مخصوص ومنفرد لہجے سے اس میں ایسا رنگ بھر دیتا ہے جو قاری کے دلوں کو چھو لیتا ہے کیوں کہ یہاں شائستگی ولطافت کے ساتھ نرم روی، بے نیازی اور درویشانہ قناعت کا احساس ہوتا ہے۔

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے
سنبھال کشتیِ دل کو قلندری یہ ہے

نکال خاطر فاطر سوں جام جم کا خیال
صفا کر آئینہ دل کا سکندری یہ ہے

عشق نے ولؔی کے دل کو گداز کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا سوز وگداز پر اثر ہے۔ ولؔی کے یہاں واردات قلبی اور حسن و جمال کی صفات کا اظہار اتنے سادہ اور سلیس انداز میں ہوا ہے کہ براہ راست دل تک پہنچتا ہے۔ ولؔی مجاز

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

کے پردے میں حقیقت کے راز ہائے سربستہ کی عقدہ کشائی بھی کرتے ہیں اور ان کے یہاں مجاز و حقیقت کہیں کہیں الگ الگ بھی ہیں لیکن اکثر یہ ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ ان کا محبوب بھی مجازی اور حقیقی دونوں روپ میں نظر آتا ہے۔ ولی کا محبوب اردو شاعری کا وہ روایتی محبوب نہیں ہے جو کسی اور دنیا کی مخلوق معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کے محبوب کا تعلق اسی عالم رنگ و بو سے ہے جو اپنے زمانے کی تہذیبی روایات کا حامل ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ کہیں کہیں فارسی روایات کے برعکس اپنے محبوب کے لیے مؤنث کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکار سناتی جا

ولی کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی روایات کے ساتھ ہندی روایات کو بھی بخوبی برتا ہے اور دونوں کو ایسا شیر و شکر کیا ہے کہ ایک نیا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ ولی کے کلام میں کرشن اور گوپیاں بھی ہیں، ارجن بھی ہیں جوگی، بیراگی اور سنیاسی بھی، دیوالی کے دیئے بھی روشن نظر آتے ہیں تو بانسری کے سر بھی سنائی دیتے ہیں اور طبلے کی چھاپ بھی گونجتی ہے، وہیں گنگ و جمن، تاپتی و نربدا کے دھارے بھی بہتے نظر آتے ہیں۔

مثال کے لیے چند اشعار پیش ہیں:

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

گنگا رواں کیاں ہوں اپس کے نین ستی
آ اے صنم شتاب ہے روزے نہان آج

تری زلفاں کے حلقے میں دِسے یوں نقش رخ روشن
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی میں

اسی طرح ولی نے ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت استعمال کرنے کی بھی مثال قائم کی ہے جیسے روزِ نہاں، رنگ پان، نین ساقی وغیرہ۔

ولی کے کلام میں استعمال ہونے والی زبان پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے یہاں دکنی، گجری، ہندوی اور دوسری علاقائی بولیوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ بعض ناقدین فن نے ان کے اشعار کو زبان کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ ہیں جن میں خالص دکنی، گجری اور ہندوی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن ان کی زبان بھی قدیم دکنی شعرا کے مقابلے کافی صاف اور سادہ ہے۔ دوسرے وہ اشعار جن میں لفظوں کی تبدیلی سے اس وقت کی زبان بن سکتی ہے۔ تیسرے وہ اشعار ہیں جن کی زبان اور تراکیب بالکل میر و سودا کے دور کی ہے۔ ولی نے اپنے عہد سے پہلے کی زبان اور جدید زبان کے اثرات اپنی شاعری میں اس طرح جذب کیے ہیں کہ وہ نہ صرف شمال و جنوب دونوں جگہوں کے عوام کے لیے باعث انبساط ہو

گئی بلکہ آنے والی نسلوں کی لطف اندوزی کا سامان بھی فراہم کر دیا۔اس سلسلے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''دلچسپ بات یہ ہے کہ ولی کے یہاں زبان کا ارتقا ایک طرف دکنی سے ریختہ کی طرف ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ ریختہ سے اردوئے معلیٰ کی طرف بھی۔ یہ دونسلوں کا کام ولی نے خود انجام دیا۔''

(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،2013،ص:413)

ولی کسی جذبے، کسی احساس، کسی خیال یا کسی کیفیت کے اظہار کے لیے نہ تو فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور نہ معنوی تہہ داری سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر بات اتنے سیدھے سادھے اور دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کا دل موہ لیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب کا نام شاعری ہے۔ اس کی اعلیٰ مثال ولی کی شاعری ہے۔ وہ موضوع سے مناسبت رکھنے والے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ اس کی سلاست اور روانی کسی نرم سیر دریا کی طرح رواں رہتی ہے جس سے ہلکی ہلکی سکون بخش موسیقی پھوٹتی رہتی ہے۔

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جوں بیہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

ولی، دکنی، ہندوی اور فارسی محاوروں اور ضرب الامثال کو اس صفائی اور برجستگی سے کھپاتے ہیں کہ لطف اندوزی دوبالا ہو جاتی ہے۔ ولی نے ایہام کو بہت کم برتا ہے لیکن جہاں برتا ہے نہایت چابکدستی کے ساتھ۔

گرچہ لچھمن ترا ہے رام ولے
اے سجن تو کسی کا رام نہیں

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال   ہندوئے ہردوار باسی ہے

کہا جاتا ہے کہ عظیم فن پارہ وہ ہے جس پر وقت کا اثر نہیں ہوتا اس کی تابندگی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ولی کی شاعری کا بھی وہی عالم ہے کہ جو تھا۔ وہ زندہ ہے روشن ہے، اس کی تابندگی نہ کم ہوئی ہے نہ کم ہوگی۔

5.3.1 متن کی تدریس

غزل I

جسے عشق کا تیر کاری لگے   اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دم مرگ لگ   جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہوئے اسے جگ میں ہرگز قرار   جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں　　پیارے! تری بات پیاری لگے
ولی کوں کہے تو اگر اک بچن　　رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

اشعار کی تشریح:

غزل کے متن کی براہِ راست تدریس شروع کرنے سے پہلے استاد کو چاہیے کہ وہ پہلے غزل کے بارے میں بتائے کہ غزل کہتے کسے ہیں؟ اس کی صنفی شناخت کیا ہے؟ یعنی ہم یہ کس طرح پہچانیں کہ یہ غزل ہے مثنوی نہیں ہے۔ کچھ اصناف اپنی ہیئت سے پہچانی جاتی ہیں اور کچھ موضوع سے۔ غزل اپنی ہیئت سے پہچانی جاتی ہے اس لیے طلبہ کو اس کی ہیئت کے بارے میں بتائیں، پھر غزل کے فن پر روشنی ڈالیں کہ غزل کے فنی امتیازات کیا ہیں۔ غزل کے آغاز وارتقا سے بھی طلبا کو روشناس کرانا چاہیے۔

مذکورہ متن ولی کی تخلیق ہے اس لیے ولی کے حالات زندگی اوران کی شاعری کی امتیازی خصوصیات سے بھی طلبا کو واقف کرایا جائے۔ اب بات آتی ہے متن کی تو اس پر اس طرح روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

اس غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ پوری غزل میں شاعر نے عشق کی ماہیت اس سے پیدا ہونے والی کیفیات و صورت حال کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ شعر بہت سیدھے سادے انداز اور آسان ترین الفاظ میں کہا گیا ہے جو سہل ممتنع کے مرتبے کو پہنچ جاتا ہے۔ سہل ممتنع اس شاعری کو کہتے ہیں جو آسان اور سادہ زبان میں ہو اور جس کی نثر نہ کی جاسکے۔ اس میں شاعر کہتا ہے کہ اگر کسی کو واقعی عشق ہو جائے تو اسے زندگی گزارنی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ عشق میں وہ کلفتیں اور اذیتیں جھیلنی پڑتی ہیں کہ اسے زندگی بھاری لگنے لگتی ہے۔ یا تو شاعر عشق کے ان مراحل سے گذرا ہے یا مشاہدے سے یہ تجربہ حاصل کیا ہے اور جس کو بڑے اچھے اسلوب میں بیان کر دیا۔

نہ چھوڑے محبت دم مرگ لک　　جسے یار جانی سوں یاری لگے

اس شعر میں شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ یار جانی یعنی جان کی طرح عزیز محبوب سے اگر یاری یعنی محبت ہو جائے تو وہ پھر زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہے۔ اس میں شاعر محبوب کی تعریف وتوصیف بیان کر رہا ہے کہ محبوب اتنا دل فریب اور خوش ادا ہے کہ ایک بار اس سے محبت ہو جائے تو پھر اس سے روگردانی ممکن نہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشق ایسا روگ ہے کہ ایک بار لگ گیا تو پھر موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار　　جسے عشق کی بے قراری لگے

شاعر اس شعر میں سیدھے سیدھے عشق کی ایک کیفیت بیان کر رہا ہے کہ اگر کسی کو عشق ہو جائے تو یہ ایسی بے چین کر دینے والی چیز ہے کہ اسے دنیا میں کہیں قرار اور سکون نہیں ملے گا۔

ولی کوں کہے تو اگر اک بچن　　رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

اس شعر میں شاعر محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو مجھ سے تھوڑی سی بھی بات کرے تو رقیبوں کے دل پر کٹاری کی طرح لگتی ہے یعنی رقابت کی وجہ سے وہ جل بھن جاتے ہیں۔

غزل II

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی وکیا مجازی کا
ہر زباں پر مثل شانہ مدام — ذکر تجھ زلف کی درازی کا
ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی — جب سوں دیکھا سوار تازی کا
نین دکھا کے اُپس کے مکھ کی کتاب — علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا
آج تیری بھواں نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
گر نہیں راز عشق سوں آگاہ — فخر بیجا ہے فخر رازی کا
اے ولیؔ! سرو قد کوں دیکھوں گا — وقت آیا ہے سرفرازی کا

اشعار کی تشریح:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی وکیا مجازی کا

شاعر نے اس شعر میں عشق کی توصیف بیان کی ہے کہ خواہ عشق حقیقی ہو یا مجازی ہو وہ لائق ستائش ہے کیوں کہ عشق حقیقی قرب الٰہی کا وسیلہ ہے اور عشق مجازی اس کا پہلا زینہ۔ یہاں شاعر نے عشق کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔

ہر زباں پر مثل شانہ مدام — ذکر تجھ زلف کی درازی کا

اس شعر میں شاعر کا موضوع محبوب کی زلف کی تعریف ہے۔ اس زلف کی صفت یہ ہے کہ بہت لمبی ہے جس سے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گیا ہے۔ شاعر اس سیدھی سی بات کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر زبان پر تیری زلف کی درازی کا چرچا ہر وقت رہتا ہے۔ وہ لوگوں کی زبانوں کو شانہ یعنی کنگھی سے تشبیہ دیتا ہے کہ اس میں بھی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں اور شانہ کا لفظ زلف کی مناسبت سے لایا گیا ہے جسے رعایت لفظی کہتے ہیں۔ لوگوں کی زبان پر ہمیشہ تیری زلف کی درازی کا ذکر رہتا ہے اور کنگھی بھی تیری زلف کے قریب رہتی ہے۔ دونوں میں مماثلت ہے۔

ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی — جب سوں دیکھا سوار تازی کا

یہاں شاعر اپنے محبوب کو تازی گھوڑے پر سواری کرنے والا شاندار سوار بتا رہا ہے (تازی گھوڑے کی ایک اچھی نسل) لہٰذا وہ کہتا ہے کہ جب سے میں نے اس شاندار سوار کو دیکھا ہے میرے ہاتھ سے ہوش وحواس کی لگام چھوٹ گئی یعنی میرے ہوش و حواس جاتے رہے۔ یہاں بھی رعایت لفظی ہے۔ تازی یعنی گھوڑے کی رعایت سے عناں یعنی لگام لائے ہیں۔

نین دکھا کے اُپس کے مکھ کی کتاب — علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تو نے اپنے رخ کی کتاب حسن کو کیا دکھایا کہ میں سارے علم بھول گیا۔ یہاں بھی محبوب

کے حسن کی تعریف کی جارہی ہے۔ کتابی چہرہ ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہوتا ہے بہت خوبصورت چہرہ، کتابی کی مناسبت سے علم لائے ہیں۔ یہ بھی معشوق کی تعریف کا ایک نرالا طور ہے۔

آج تیری بھواں نے مسجد میں ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

مسجد میں محراب ہوتی ہے۔ مسجد کی محرابوں نے تیرے بھوؤں کی ایسی یاد دلائی کہ تمام نمازیوں نے ہوش کھو دیئے۔ یہاں محبوب کی بھوؤں کے متناسب محرابی زاویے کی تعریف مقصود ہے جو مسجد کی خوبصورت محراب کے مانند ہے۔

گر نہیں راز عشق سوں آگاہ فخر بیجا ہے فخر رازی کا

یہاں بھی عشق کو بہت وسیع و بلیغ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تو عشق کی اصلیت، ماہیت اور کیفیت سے آگاہ نہیں تو ابوبکر محمد ابن ذکریا رازی کے برابر بھی ہو جائے، جس پر دنیا فخر کرتی ہے، تو بھی تجھ پر فخر نہیں کیا جا سکتا۔

اے ولی، سرو قد کوں دیکھوں گا وقت آیا ہے سرفرازی کا

یہاں شاعر اپنے محبوب کے قد کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آج میں سرو کی طرح بلند قامت محبوب کو دیکھوں گا۔ چونکہ وہ بلند و بالا ہے اس لیے سر اٹھا کے ہی دیکھوں گا اس کے ایک معنی یہ بھی ہے کہ محبوب کا دیدار کرنا اس کے لیے سعادت اور سرفرازی ہے۔ سرفرازی کا مطلب ہے فخر سے سر اونچا کرنا۔

5.3.2 سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات

دکنی شاعروں میں ولی کے بعد سراج کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے اور دکن ہی کیا شمال میں بھی ایک عرصہ گزر جانے اور زمین سخن کے آسمان ہو جانے (مری قدر کر اے زمین سخن ☆ تجھے بات میں آسماں کر دیا) کے باوجود سراج کا نام بہت ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ولی کے بعد اور عہد میر و سودا سے قبل کے سب سے بڑے شاعر سراج ہیں۔ اس عہد کے تذکرہ نگاروں نے سراج کی شاعری پر تو کافی لکھا ہے مگر ان کی شخصیت اور خاندانی حالات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ لچھمی نرائن شفیق سراج کے معتقد بھی تھے اور ان سے دو بار ملاقات بھی کر چکے تھے مگر اپنے تذکرے ''چمنستان شعرا'' میں ان کے سوانحی حالات زیادہ تحریر نہ کر سکے۔ 1940ء میں عبدالقادر سروری نے کلیات سراج مرتب کیا مگر وہ بھی سراج کے حالات، دستیاب نہ کر سکے۔

سراج کا دیوان ان کے برادر طریق عبدالرسول خاں نے 1739ء میں مرتب کیا اور اس کا نام ''انوارالسراج'' رکھا۔ سراج کے قریبی دوست ضیاء الدین پروانہ نے اس پر مقدمہ لکھا۔ اس مقدمے سے سراج کے بہت سے سوانحی گوشے روشن ہوئے ہیں۔ ''انوارالسراج'' کا مخطوطہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کہیں سے حاصل کر لیا اور اب وہی سراج کے حالات زندگی کے انکشافات کا معتبر ذریعہ ہے۔

سراؔج کا اسم گرامی سید سراج الدین تھا۔ سراؔج کے جدامجد مدینہ سے ہجرت کر کے ہندستان آئے اور نواح دہلی میں آباد ہو گئے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ سید درویش نے اورنگ زیب کے عہد میں ہجرت کر کے اورنگ آباد کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ ان کا خاندان صوفیانہ طرز زندگی کی طرف مائل تھا چنانچہ سید درویش بھی درس و تدریس اور ذکر و اذکار میں اپنا وقت گزارتے تھے۔

اورنگ آباد کے نواح میں رہنے والے صوفی سید عبداللطیف کی صاحبزادی سے سید درویش کا عقد ہوا اور 13 ؍صفر 1124ھ (21؍مارچ 1712ء) کو ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سید سراج الدین رکھا گیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے سراؔج کی تاریخ پیدائش 1716ء متعین کی تھی جو نثار احمد فاروقی والے مخطوطے کے حاصل ہو جانے کے بعد غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ سید درویش کی کسی اور اولاد کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج سید درویش کی اکیلی اولاد تھے۔

بہر حال سید درویش چونکہ درس و تدریس سے ہی ملحق تھے۔ لہٰذا سراج کی تربیت اور علوم متداولہ کی تدریس انھوں نے خود ہی کی۔ لیکن سراج بارہ تیرہ سال کے ہوئے تو ان پر دیوانگی طاری ہونے لگی
کہتے ہیں کہ یہ دیوانگی عشق کا نتیجہ تھی۔ کبھی کبھی کیفیت دیوانگی اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ گھر سے نکل کر جنگل و بیابان میں پھرا کرتے اور حضرت برہان الدین کی درگاہ میں پڑے رہتے یہاں تک کہ انھیں اپنی بے لباسی کا بھی خیال نہیں رہتا۔ کبھی کبھی تو ان کے والد کو انھیں پابہ زنجیر کرنا پڑتا۔ سراؔج کا یہ عارضہ دیوانگی متواتر سات سال تک چلتا رہا۔ حالت دیوانگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ فارسی اشعار نکلتے تھے۔ ’’انوارالسراج‘‘ کے دیباچے میں سراؔج نے خود لکھا ہے کہ جب بھی ان پر دیوانگی کا عالم طاری ہوتا تو ان کی زبان سے فارسی اشعار نکل پڑتے۔ مگر افسوس کہ انھیں محفوظ نہیں کیا جا سکا۔

(پروفیسر نثار احمد فاروقی، سراج اورنگ آبادی پر نئی روشنی، امکان، سراج نمبر، ص:16)

اتنی کم عمری میں اتنا علم حاصل کر لینا ہے تو تعجب خیز لیکن تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھیں فارسی شعرا کے دیوان کے دیوان ازبر تھے۔ اس سے ان کے قوت حافظہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور فارسی اشعار کا بے محابہ نکل پڑنا بھی ممکن معلوم ہوتا ہے۔

عارضۂ دیوانگی سے افاقے کے بعد تقریباً 1731ء میں ایک صوفی سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر کے سراؔج باقاعدہ صوفی ہو گئے اور پھر ساری زندگی اسی طرح گزار دی۔ 1739ء میں سراج کے برادر طریق عبدالرسول خاں نے دیوان سراج مرتب کیا۔ جمیل جالبی ’’منتخب دیوانہا‘‘ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ’’اور جب اسے (دیوان سراج کو) پیر و مرشد کی خدمت میں پیش کیا گیا تو حکم ہوا کہ شعر گوئی ترک کر دی جائے۔‘‘

(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013)

سراؔج نے شاعری ترک کر دی اور دریائے تصوف میں غرق ہو کر باقاعدہ صوفی بن گئے۔ 1730ء میں جب سراؔج کا دیوان مرتب ہوا اس وقت ان کی عمر ستائیس یا اٹھائیس سال تھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سراؔج کا ضخیم کلیات جس میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے، ترجیع بند، مخمسات اور رباعیاں شامل ہیں صرف سات آٹھ سال کا نتیجۂ فکر ہیں۔

سید یحییٰ نشیط سراج کے کچھ خطوط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان خطوط کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ غلبہ شوق کے عارضے سے نکلنے اور سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی کی ادارت قبول کر لینے کے بعد سراؔج نے تجرد کی زندگی بسر کرنا پسند کرلیا تھا۔ چونکہ عزلت گزینی پسند تھی اس لیے تزوج کے دام میں پھنسنا انھوں نے قبول نہیں کیا اور ساری زندگی اپنے تکیہ میں تنہا گزار دی۔''

(سید یحییٰ نشیط، سراؔج اورنگ آبادی، مونوگراف، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی، 2016، ص:11)

سراؔج آخری وقت میں بہت علیل ہوگئے تھے۔ انھیں بواسیر، اسہال اور ضعف معدہ جیسے امراض لاحق ہوگئے تھے آخر انھیں امراض میں 4/شوال 1177ھ بروز جمعہ (1763ء) اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ وفات کے وقت ان کی بزرگی کا ڈنکا ہر طرف بج رہا تھا خاصی تعداد میں ان کے شاگرد موجود تھے۔ ان کی وفات پر سارے شہر میں سوگ منایا گیا۔ ان کے شاگردوں نے اورنگ آباد میں ہی ان کا مقبرہ بنا دیا جو آج بھی موجود ہے۔

شاہ عبدالرسول خاں کے مرتب کردہ کلیات کو بنیاد بنا کر عبدالقادر سروری نے جو کلیات مرتب کیا ہے اس کا کل سرمایہ غزلیات کے تین ہزار چھ سو اشعار، مثنویوں کے ایک ہزار پانچ سو چار، فردیات، قصیدہ، مستزاد، بازگشت اور مناجات کے ایک سو اٹھائیس اشعار، نو رباعیات، پچاس مخمسات اور چار ترجیع بندوں پر مشتمل ہے۔ کلیات کی یہ ضخامت وہ بھی اتنی قلیل مدت میں سراؔج کے تبحر علمی پر دلالت کرتی ہے۔

سراؔج کی مثنویوں میں بوستان خیال، سوز و گداز، نالہ ہجر، احوال فراق، خط بندگی اور مطلب دل شامل ہیں، ان میں ''بوستان خیال'' سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے جس میں گیارہ سو ساٹھ اشعار ہیں۔ سراؔج نے اسے صرف دو دن میں قلم بند کیا تھا یہ سوانحی مثنوی ہے، اس میں سراؔج نے اپنے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ خصوصاً واردات عشق کا بیان تفصیل سے پیش کیا ہے۔

سراؔج کو فارسی سے بہت رغبت تھی، اسی ذوق وشوق کے تحت انھوں نے فارسی شعرا کے بہت سے دیوان جمع کر لئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس 647 شعرا کے دواوین اکٹھا ہوگئے تھے۔ پھر انھیں میں سے اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب کر کے ایک ضخیم بیاض تیار کی جس کا تاریخی نام ''منتخب دیوانہا'' رکھا اس بیاض کے لیے انھوں نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا۔ مقدمے سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تدوین انھوں نے حروف تہجی کے لحاظ سے کی اور اشعار کی ترتیب میں ردیف کا خیال رکھا، اس بیاض سے ان کا فارسی سے لگاؤ واضح ہوتا ہے۔ اس سے ان کے فارسی کلام کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کا بہت کم حصہ محفوظ ہو سکا۔

سراؔج کی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جیسے حمد، نعت، منقبت، مناجات اور خطوط وغیرہ مگر یہاں سب کی تفصیل ممکن نہیں۔

سراؔج کی شاعری میں عشق کا عنصر غالب ہے اور صوفی ہونے کے باوجود ان کا عشق مجازی ہے لیکن یہ وہ مجاز ہے جس کے ذریعے صوفیا حقیقت کے زینے طے کرتے ہیں۔ گوکہ سراؔج نے واردات عشق کے بصری پیکر تراشے ہیں لیکن ان میں نہ تو جنسی تلذذ کا رجحان ہے نہ ستی لذت پرستی کا ذکر۔ ان کا عشق بہت وسیع ہے یہ وہ عشق ہے جو بے خطر آتش نمرود میں کود کر حقیقت کا ادراک چاہتا ہے۔ جس کے بارے میں رومی نے کہا تھا کہ ''عقل ورق پہ ورق سیاہ کر دیتی ہے۔ لیکن عشق پورے آفاق کو منور کر دیتا ہے۔ وہ کاغذ اور روشنائی سے بے نیاز ہے اور براہ

راست گوشۂ دل کو منور کرتا ہے۔ عقل ماورائی جہات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔''
(سید نعیم الدین، مرید ہندی، آزاد کتاب گھر، دہلی، 1992، ص:55)

سراؔج کا عشق بھی اسی طرح گوشۂ دل کو منور کرتا ہے۔

روشن ہے سبب عشق کے کیفیت عالم
آئینہ دل ساغر جمشید ہوا ہے

دوسرے بڑے شاعروں کی طرح سراؔج بھی کمند عقل سے آزادی چاہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عشق کے مراحل عقل سے نہیں جذبے سے طے ہوتے ہیں۔

اگر خواہش ہے تجھ کوں اے سراؔج آزاد ہونے کی
کمند عقل کو اپنے گلے کا ہار مت کیجو

سراؔج کے عشق میں ارضیت ہے اس میں سرور و انبساط اور جذب و کیف کے ساتھ جو تڑپ ہے۔ اس میں تسکین اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔

لب و رخسار کے گل قند سے لازم ہے علاج
دل کے آزار سیں بیمار ہوں، کن کا، ان کا

سراؔج غم عشق کو شعوری طور پر اپنے اندر اتار لیتے ہیں اور پھر اس کی ساری کیفیات کا سرشاری کے ساتھ اظہار کرتے ہیں یہ عمل شعر کے تاثر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ان کے غم عشق کے اظہار میں جو فطری والہانہ پن ہے وہ شاعر کی اندرونی کیفیت کو قاری کے دلوں میں اتار دیتا ہے۔

اے جان سراؔج ایک غزل درد کی سن جا
مجموعہ احوال ہے دیوان ہمارا

تڑپنا، تلملانا، غم میں جلنا، خاک ہوجانا
یہی ہے افتخار اپنا یہی ہے اعتبار اپنا

سراؔج نے خالص صوفیانہ شاعری بھی کی ہے جو سادگی اور وفور جذبات سے پر ہے۔ اس میں وہ بے ساختگی ہے جو خلوص سے پیدا ہوتی ہے۔

نظر کر دیکھ ہر شے مظہر نور الٰہی ہے
سراؔج اب دیدۂ دل سیں صمد دیکھا صنم بھولا

عکس جمال دوست اسے آشکار ہے
درپن سیں دل کے زنگ کدورت کیا جو صاف

سراؔج کے یہاں کہیں کہیں صنعت ایہام کا استعمال ہوا ہے مگر اس طرح نہیں کہ جو اردو شاعری پر ایک بدنما داغ بن گیا تھا بلکہ وہ بڑے نفیس انداز سے نازک خیالات کو لفظ و معنی میں پرو دیتے ہیں۔ ان کے ایہام میں کہیں

ابہام نہیں آنے پایا ہے۔ان کی سادہ گوئی تفہیم وترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیتی۔

میرے بغل میں خواہش دنیا کا بت نہیں
کچلا ہوں میں نے لات سے سر اس منات کا

آیا پیا شراب کا پیالہ پیا ہوا
دل کے دیئے کی جوت سے کاجل دیا ہوا

ناقدین نے دکن میں ولی کے بعد سراج کی شاعری کو صناعی کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔سراج فصاحت سے زیادہ بلاغت پر زور دیتے ہیں یعنی وہ معنوی خوبیوں اور بے ساختہ پن کے قائل ہیں اور سادگی کا یہ عالم ہے کہ معنوی تہہ داری بھی شعر میں ثقالت اور پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دیتی۔تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا استعمال ان کے یہاں بہت فطری انداز میں ہوا ہے۔

تجھ کو اے آہو نگہ کس نے سکھایا یہ طرح
یا تو تھا اوروں سیں رم یا ہم سے رم ہونے لگا

سراج صنعتوں کو اس خاص اسلوب میں پیش کرتے ہیں کہ شعر سہل ممتنع کی مثال بن جاتا ہے۔صنعت تضاد کا یہ شعر دیکھیں:

وصل کے دن شب ہجراں کی حقیقت مت پوچھ
بھول جاتی ہے مجھے صبح کو پھر شام کی بات

سراج نے لف ونشر کی چاروں قسموں کا بہت بے ساختہ استعمال کیا ہے یہاں لف ونشر مرتب کی صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

یار نے ابرو و مژگاں سے مجھے صید کیا
صاحب تیر و کماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

رعایت لفظی کی مثال دیکھیں:

سودائی بازار محبت جو ہوا ہے
زنہار خیال اس کو نہیں سود و زیاں کا

کہاں تک مثالیں دی جائیں اس ضمن میں اتنا بس ہے کہ سراج کو صنعتوں کے استعمال میں ملکہ حاصل تھا۔وہ صنعت لفظی ومعنوی کو برتنے کا ہنر جانتے تھے۔

سادگی، پرکاری اور بے ساختگی گو کہ سراج کا طرۂ امتیاز ہے پھر بھی کہیں کہیں انھوں نے مشکل زمینوں میں بھی شعر کہے ہیں۔یعنی اس پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ایک شعر مثال کے لیے:

چشم بلبل کی بکتری والا　　　ہے کہاں چہرۂ زری والا

سراج کے یہاں محاورے اور ضرب الامثال کا بھی بہت برجستہ استعمال ہوا ہے۔

کیا ہوا گرچہ یار ہے نزدیک
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

عشق دونوں طرف سے ہوتا ہے کیوں بجے ایک ہاتھ سوں تالی

سراؔج کے یہاں ایسی تراکیب اور بندشوں کا ذخیرہ ہے جو اظہار کے وسیلوں کو آسان اور پر اثر بنا دیتا ہے جیسے لذت نعمت دیدار، کمند حلقہ گیسو، خیال عارض گل رنگ، خندۂ دنداں نما، مہ طناز، زلف گرہ دار، دام الفت، شکوۂ طرز تغافل۔ یہ ایسی تراکیب ہیں جنھوں نے سراؔج کے کلام میں موسیقیت کو عروج بخشا ہے۔

سراؔج کی شاعری زبان پر ماہرانہ اور خلاقانہ استعمال کی مظہر ہے۔ انھوں نے عربی، فارسی، ہندی اور مراٹھی سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ اور زبان پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کے یہاں ہندی الفاظ کا بہت استعمال ہوا ہے، کہیں کہیں تو وہ فارسی اور ہندی الفاظ کو ملا کر تراکیب بناتے ہیں، جیسے نقش چرن، طوالت کے خوف سے یہاں صرف دو شعر مثال کے لیے دیئے جا رہے ہیں۔

عشق کی جو لگن نہیں دیکھا وہ برہ کی اگن نہیں دیکھا
ٹک زمیں پر قدم رکھیو ساجن آج نقش چرن نہیں دیکھا

سراؔج نے سادھو سنتوں کی سادھنا کی بہت سی اصطلاحات استعمال کی ہیں جیسے سمرن، مالا، بیراگی، راکھ، بھبھوت، برہ، پیا، پریتم وغیرہ۔

سراؔج کو مراٹھی زبان سے بچپن سے ہی واسطہ رہا۔ ان کے یہاں مراٹھی الفاظ اردو لفظیات کے ساتھ شیر و شکر ہو کر ایک نیا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ پن (مگر)، دستا (دکھائی دیتا)، پور اور اندھار کا انھوں نے بے ساختہ استعمال کیا ہے۔

زنجیر بھلی قید بھلی موت بھی جیوں تیوں
پن حق نہ کرے کسی کوں گرفتار کسی کا

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سراؔج کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے، وقت گزر جانے اور حالات بدل جانے کے باوجود جن کی مقبولیت اور اہمیت کم نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ عظیم شاعر اور عظیم شاعری کی یہی شناخت ہے۔

5.3.3 متن کی تدریس

غزل I

اس پھول سے چہرے کو جو کوئی یاد کرے گا
ہر آن میں سو سو چمن ایجاد کرے گا
جس بیت میں تعریف لکھوں اس کی بھنوؤں کی
البتہ ہلالی بھی اسے صاد کرے گا

مغرور نہ ہو صافیٔ رخسار پہ اپنے
پھر ئیں تو مری بات کو تو یاد کرے گا
البتہ سر آنکھوں سے کروں گا اسے منظور
جو عشق کا ہادی مجھے ارشاد کرے گا
معلوم ہوا عشق کے اطوار سے یوں کر
مجھ عقل کی بنیاد کوں برباد کرے گا
جلتا ہے سراؔج آتش ہجراں میں صنم کی
کس دن دل غمگیں کوں مرے شاد کرے گا

اشعار کی تشریح:

اس پھول سے چہرے کو جو کوئی یاد کرے گا
ہر آن میں سو سو چمن ایجاد کرے گا

عشق سراؔج کی شاعری کا محور ہے اور محبوب اس کا مرکزی نکتہ وہ عشق کی کیفیات کو سو سو طرح سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں پھر بھی محسوس کرتے ہیں کہ بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔ لہٰذا نئے نئے زاویئے پیدا کرتے ہیں۔ رُخِ محبوب کو پھول کہنا یا پھول سے تشبیہ دینا بڑا پامال موضوع ہے۔ سراؔج نے اسے پھول کہا تو ہے لیکن اس میں ایک نیا زاویہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ پھول تو ہے مگر ایسا کوئی عام سا پھول نہیں بلکہ پھولوں کا چمن زار ہے۔ اسے دیکھنا تو دور اسے یاد کرتے ہی ہر آن نظروں میں سو سو چمن کھل جاتے ہیں محبوب کی تعریف کا یہ نرالا انداز ہے۔

جس بیت میں تعریف لکھوں اس کی بھنوؤں کی
البتہ ہلالی بھی اسے صاد کرے گا

یہاں شاعر کا مقصد محبوب کی بھنوؤں کی تعریف کرنا ہے، لہٰذا وہ کہتا ہے کہ محبوب کی بھویں اتنی خوبصورت ہیں کہ اگر کسی شعر میں اس کی تعریف لکھوں تو ماہ نو بھی اسے تسلیم کرے گا جبکہ ماہ نو خود بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ محبوب کی بھنوؤں کو براہ راست ماہ نو سے تشبیہ دینے کے بجائے ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے یہی سراؔج کی انفرادیت ہے۔

مغرور نہ ہو صافیٔ رخسار پہ اپنے
پھر ئیں تو مری بات کو تو یاد کرے گا

یہاں شاعر محبوب سے کہہ رہا ہے کہ اپنے ہموار، چکنے اور بے داغ رخسار پر غرور مت کر۔ (ورنہ جب شباب کا عالم ختم ہو جائے گا) نہیں تو ایک نہ ایک دن تو میری بات کو ضرور یاد کرے گا۔ اس شعر میں محبوب کے رخساروں کی تعریف کی گئی ہے اور غرور سے پرہیز کرنے کی صلاح بھی دی گئی ہے جو ایک اخلاقی نکتہ ہے۔ بنیادی مقصد یہاں بھی محبوب کے صاف شفاف رخساروں کی تعریف کرنا ہے۔

البتہ سر آنکھوں سے کروں گا اسے منظور
جو عشق کا ہادی مجھے ارشاد کرے گا

سراؔج کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ بات کو گھما پھرا کر پیچیدہ بنا کر نہیں پیش کرتے سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے ہیں جس سے براہ راست ترسیل کے راستے کھلتے ہیں۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ عشق کا راستہ دکھانے والا جس طرف رہنمائی کرے گا جس راستے پر چلنے کو کہے گا اسے دل کی گہرائیوں سے قبول کروں گا۔ سر آنکھوں سے قبول کرنے کا مطلب اسے صدق دل سے قبول کروں گا۔ عشق کا ہادی سے مراد محبوب بھی ہو سکتا ہے مگر یہاں غالب رجحان پیرو مرشد کی طرف ہے۔

معلوم ہوا عشق کے اطوار سے یوں کر
مجھ عقل کی بنیاد کوں برباد کرے گا

اس شعر میں شاعر کہتا ہے عشق سے راہ و رسم بڑھانے کے بعد اس کے طور طریقوں سے یہ معلوم ہوا کہ راہ عشق پر چلنے کے لیے عقل راہ نما نہیں ہو سکتی یہاں تو جذبہ بے اختیار سے کام بنتا ہے۔ عقل کوں برباد کرے گا مطلب ہے کہ جب عشق اختیار کیا تو اس میں عقل تو کچھ کام نہیں آئے گی گویا وہ برباد ہی ہوگی اور اس کی بربادی کا سبب عشق ہوگا۔ عقل تو لب بام محو تماشائی ہے مگر جذبۂ عشق ایک جست میں قصہ تمام کر دے گا۔

جلتا ہے سراؔج آتش ہجراں میں صنم کی
کس دن دل غمگیں کوں مرے شاد کرے گا

سراؔج کے یہاں عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو۔ اس شعر میں بھی وہ ہجر کی کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ اظہار محبوب سے براہ راست ہے اور بہت سیدھے سادھے الفاظ میں ہے کہ میں عشق میں ہجر کی کلفتوں کو جھیل رہا ہوں آخر تو میرے دل کو کب شاد کرے گا مجھے اس غم سے کب نجات دلائے گا یعنی تیرا وصل آخر کب نصیب ہوگا کہ یہ میرا دل شاد ہو جائے۔

غزل II

ہوا ہوں ان دنوں مائل کسی کا	نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا
دوانے دل کوں سمجھاتا ہوں لیکن	کہاں لگ ہوئے کوئی حائل کسی کا
خم گیسو سیں اپنے گرہ کھول	کھلے تا عقدۂ مشکل کسی کا
حنا سیں تم نے نہیں باندھے ہو موٹھی	لیے ہو، ہات، شاید دل کسی کا
گلی میں جس کے شور کربلا ہے	سلونا شوخ ہے قاتل کسی کا
سراؔج اب سوز دل میرا وو جانے	جو ہے پروانۂ محفل کسی کا

اشعار کی تشریح:

ہوا ہوں ان دنوں مائل کسی کا
نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا

چھوٹی بحر کی غزل ہو یا طویل بحر کی سراؔج کا سہل ممتنع ہر جگہ قائم رہتا ہے۔ یہ چھوٹی بحر کی غزل ہے مگر اس میں سہل ممتنع کا استعمال قابل دید ہے۔ اس شعر میں وہ اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہے ہیں کہ ان دنوں مجھے کسی

سے عشق ہو گیا ہے۔ نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا، اس میں عشق کی شدت کا دبا دبا اظہار ہے کہ اس سے پہلے مجھے اس غم کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔

دوانے دل کوں سمجھاتا ہوں لیکن
کہاں لگ ہوئے کوئی حائل کسی کا

اس شعر میں سراج نے ایک انوکھا انداز اختیار کیا ہے کہ وہ دل کو غیر تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دل کو جو عشق میں دیوانہ ہو گیا ہے، لاکھ سمجھاتا ہوں کہ عشق میں بہت پریشانیاں ہوتی ہیں بہت مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں اس سے باز آ جا لیکن وہ مانتا نہیں پھر عاجز آ کر کہتے ہیں کہ آخر دوسروں کے معاملات میں کوئی کہاں تک حائل ہو۔ کہاں لگ ہوئے کوئی حائل کسی کا۔ ''کسی کا'' سے دل کی غیریت قائم ہوتی ہے۔

خم گیسو سیں اپنے گرہ کھول
کھلے تا عقدۂ مشکل کسی کا

اس میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تو نے اپنے گیسو میں خم ڈال کر جو گرہ باندھ رکھی ہے یعنی دل میں کدورت رکھی ہے۔ ''گرہ کھولنا'' کا مطلب کدورت دور کرنا بھی ہوتا ہے۔ اپنے دل سے کدورت دور کر، تو میرے اوپر جو مشکل پڑی ہوئی ہے اس کا بھید کھلے یعنی تو مجھ سے گریزاں کیوں ہے اس کا راز کھلے اور میری مشکل آسان ہو جائے۔

حنا سیں تم نے نہیں باندھے ہو موٹھی
لیے ہو، ہات، شاید دل کسی کا

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ یہ تم نے مہندی لگے ہوئے ہاتھ کی مٹھی نہیں باندھ رکھی ہے بلکہ شاید ہاتھ میں کسی کا، کسی عاشق کا، دل لے رکھا ہے یہ ہاتھ کا حنائی رنگ نہیں بلکہ دل پر خوں کا عکس ہے۔

گلی میں جس کے شور کربلا ہے
سلونا شوخ ہے قاتل کسی کا

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ یہ جس کی گلی میں کربلا کا سا شور ہے جس میں عاشقاں ایک کے بعد ایک قتل ہو رہے ہیں۔ ان کا قاتل کوئی اور نہیں بلکہ اپنا خوبصورت شوخ محبوب ہی تو ہے جس کے حسن پر لوگ پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ یہ بھی محبوب کے حسن کی تعریف کا ایک انداز ہے۔

سراج اب سوز دل میرا وہ جانے
جو ہے پروانۂ محفل کسی کا

سراج اس شعر میں محبوب کی بے وفائی کا شکوہ کر رہے ہیں کہ میرے دل کی سوزش اور تکلیف کا ذمہ دار تو وہی ہے جو اب کسی اور کی محفل کا پروانہ ہو گیا ہے۔ یعنی اب جس کی نظر عنایت کسی اور پر ہے۔ وہ جانے سے یہ بھی مراد ہے کہ وہی چاہے تو اس کا کچھ علاج ہو سکتا ہے ہم نے تو اسی پر چھوڑ دیا ہے۔

5.4 آپ نے کیا سیکھا۔

اس اکائی میں آپ نے

- سیکھا کہ کن وجوہات کی بنا پر اردو ادب کا ارتقا پہلے دکن میں ہوا جبکہ اردو زبان کی ابتدا شمالی ہند میں ہوئی۔
- ولیؔ کی شاعری کی خصوصیات سے جانکاری حاصل کی۔
- ولیؔ کی دو غزلوں کا تجزیہ کیا۔
- سراجؔ کی شاعری کی خصوصیات سے متعارف ہوئے۔
- سراجؔ کے کچھ اشعار کو سمجھنے کی کوشش کی۔

5.5 اپنا امتحان خود لیجئے۔

1- اردو زبان کے شمال سے دکن پہنچنے کے اسباب کیا تھے؟

2- سراج کہاں پیدا ہوئے اور ان کا مقبرہ کہاں ہے؟

3- سراج کی شاعری کے امتیازات کیا ہیں؟

4- سراج نے کس طرح کی زندگی گزاری؟

5- ولیؔ اور سراجؔ اورنگ آبادی کی غزلوں سے ایک ایک شعر کی تشریح کیجیے؟

I	ولیؔ:	نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک	جسے یار جانی سے یاری لگے
II	سراجؔ:	ہوا ہوں ان دنوں مائل کسی کا	نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا

5.6 سوالوں کے جوابات

1- علاؤالدین خلجی کا دکن کو فتح کر کے سو سو مواضعات کا انتظامی حلقہ بنا کر ہر حلقے پر شمال سے تعلق رکھنے والا اپنا ایک افسر (اصحاب صدہ) مقرر کرنا۔ محمد تغلق کا دارالسلطنت دہلی سے دولت آباد منتقل کرنا۔ صوفیا کی دکن کی طرف مراجعت۔

2- سراجؔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور ان کا مقبرہ بھی وہیں ہے۔

3- سراجؔ کی شاعری میں وہ عشق مجازی ہے جو عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔ وہ ولی کا تتبع کرتے ہیں۔ سادگی، سلاست، روانی اور موسیقیت ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ہندی الفاظ کا بہت برجستہ استعمال کرتے ہیں۔

4- سراجؔ نے ایک صوفی کی مجرد زندگی گزاری۔

5- ولی اور سراج اورنگ آبادی کی غزلوں سے ایک ایک شعر کی تشریح

I ولی: نہ چھوڑے محبت دم مرگ لگ جسے یار جانی سوں یاری لگے

اس شعر میں ولی دکنی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یارِ جانی یعنی جان کی طرح عزیز محبوب سے اگر یاری یعنی محبت ہو جائے تو وہ پھر زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہے۔اس میں وہ محبوب کی تعریف وتوصیف بیان کر رہے ہیں کہ محبوب اتنا دل فریب اور خوش ادا ہے کہ ایک بار اس سے محبت ہو جائے تو پھر اس سے روگردانی ممکن نہیں۔اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عشق ایسا روگ ہے کہ ایک بار لگ گیا تو پھر موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

II سراج: ہوا ہوں ان دنوں مائل کس کا نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا

اس شعر میں سراج اورنگ آبادی اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان دنوں مجھے کسی سے عشق ہو گیا ہے۔نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا، اس میں عشق کی شدت کا دبا دبا اظہار ہے کہ اس سے پہلے مجھے اس غم کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔

5.7 فرہنگ

لفظ	معنی
شمال	اتر
جنوب	دکھن
ثقافتی	تہذیبی
پایہ تخت	راج دھانی۔دارالحکومت
ہجرت	وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا
برگ وبار	پتے اور پھل
سخن	بات۔شاعری
ارباب نشاط	ناچنے گانے والے
متوازن	توازن والا
قرائن	قرینہ کی جمع،سیاق
متعلقات	متعلق کی جمع۔تعلق رکھنے والا۔لگاؤ رکھنے والا
برائے	واسطے
گفتن	کہنا
جمالیاتی	حسن شناسی
انبساط	خوشی
لبریز	بھرا ہوا
شب خلوت	رات کی تنہائی
وابستہ	متعلق
منفرد	ایک۔تنہا

متواضع	خاطر کرنے والا۔تواضع کرنے والا
سروری	سرداری۔افسری
قلندری	دین ودنیا سے آزاد آدمی
جام جمشید	جمشید کا پیالہ
رازہائے سربستہ	چھپا ہوا راز
شیروشکر	آپس میں ملا ہوا
ترکش	تیر رکھنے کا خول
بان	تیر
شتاب	جلدی
ریختہ	ملی ہوئی زبان۔اردو جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔
نرم سیر	آہستہ رو
ماہیئت	حقیقت۔اصلیت
سرفرازی	فخر سے سر اٹھا کر چلنا
نواح	قریب۔آس پاس
ملحق	ملا ہوا
متداولہ	رائجؔ
افاقہ	مرض میں کمی۔شفا
تبحر علمی	نہایت علمی وسعت
زنگ	مورچہ
آہو	ہرن
رم	بھاگنا
ہادی	رہبر۔راستہ دکھانے والا

5.8 کتب برائے مطالعہ

1- تاریخ ادب اردو، جلد اول — جمیل جالبی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013

2- ولی گجراتی — سید ظہیر الدین مدنی — ادبی پبلشرز، 8 شیفرڈ روڈ، بمبئی، 1974

3- ولی فن و شخصیت اور کلام — ساحل احمد — اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، 1979

4- اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — سید احتشام حسین — ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1983

5- سراج اورنگ آبادی (مونوگراف) — سید یحیٰ نشیط — این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 2016

اکائی 6 میر تقی میرؔ کی غزل گوئی کے بنیادی عناصر

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد
6.2 تمہید
6.3 میر تقی میرؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ
6.3.1 میر تقی میرؔ کے حالاتِ زندگی
6.3.2 میر تقی میرؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات
6.3.3 متن اور اس کی تشریح
I غزل
II غزل
6.4 آپ نے کیا سیکھا
6.5 اپنا امتحان خود لیجئے
6.6 سوالات کے جوابات
6.7 فرہنگ
6.8 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- میر تقی میرؔ کے حیات اور فن سے متعلق جانکاری حاصل کریں گے
- میرؔ کے عہد اور ان کے ہم عصروں کے کارناموں پر نظر ڈالیں گے
- میرؔ کی دو غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے
- میرؔ کے کلام کی قدر و قیمت متعین کریں گے

6.2 تمہید

1750 کے بعد جن چند بڑے شاعروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ، میر سوزؔ، میر سوداؔ، قائمؔ، تاباںؔ اور یقینؔ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ دردؔ، سوداؔ اور میرؔ اپنی الگ الگ اہمیت رکھتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ صوفی شاعر تھے ان کے یہاں پابندی سے مشاعرے ہوتے تھے۔ ان کی زبان بہت میٹھی اور سادہ تھی۔ سوداؔ نے غزلیں بھی کہیں مگر وہ اپنے قصیدوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی لکھنؤ میں بھی آؤ بھگت رہی۔ انہوں نے مثنوی، مرثیہ، ہجو اور رباعی بھی لکھیں۔ پرشکوہ الفاظ ان کے اسلوب کی شناخت ہیں۔ اس عہد کے سب

سے بڑے اور مشہور غزل گو شاعر میر تقی میرؔ ہیں جو آگرہ کے رہنے والے تھے اور بعد میں دہلی منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی بحران نے میرؔ کو غم و اندوہ کی تصویر بنا دیا تھا۔ اس میں کچھ ان کی زندگی کی ناکامیاں اور محرومیاں بھی شامل تھیں۔ دہلی کے ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے انھیں لکھنؤ بھی جانا پڑا۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ قصیدے، مثنویاں اور رباعیاں بھی کہیں۔ دہلی کے میر سوزؔ بھی اچھے شاعر تھے جو آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ تاباںؔ، فغاںؔ، مضمونؔ اور میر ضاحکؔ بھی دہلی کے ہی شاعر کہے جاتے ہیں، کیونکہ زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے یہیں گزارا تھا بعد میں لکھنؤ گئے۔

6.3 میر تقی میرؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

6.3.1 میر تقی میرؔ کے حالاتِ زندگی:

میر تقی میرؔ 1722 میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور 1810 میں لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔ میرؔ کے بزرگ حجاز سے دکن آئے۔ ان کے دادا فوج میں ملازم تھے۔ ان کے والد محمد علی درویش صفت، صوفی منش اور خدا پرست انسان تھے۔ میرؔ نے اپنی خود نوشت ''ذکر میرؔ'' میں اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے: ''وہ ایک صالح عاشق پیشہ تھے، گرم دل کے مالک، شب زندہ دار اور روز حیران کار تھے''۔ میرؔ کی ذہنی نشوونما اور تربیت ان کے خاندانی پس منظر کی رہینِ منت تھی۔ ان کے والد ان سے کہا کرتے تھے ''اے بیٹے عشق اختیار کرو کیونکہ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے، دنیا میں جو کچھ ہے ''عشق کا مظہر ہے''۔ بدقسمتی سے گیارہ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا اور سوتیلے ماموں خان آرزوؔ نے ان کی تربیت کی لیکن ماموں کے رویے نے انھیں دل برداشتہ کیا۔ ان حالات میں میرؔ جو ایک حساس دل کے مالک تھے، زیادہ ہی درد و غم میں ڈوب گئے اور احساس غم ان کی طبیعت کا خاصّہ بن گیا۔ اس زمانے میں ایک ''پری تمثال'' سے تعلق قایم ہوا اور عشق کی ناکامی نے انھیں سودائی بنا دیا۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے:

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جییں وہ، روگ جن کے جی کو یہ اکثر رہیں

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

میرؔ 17 سال کی عمر میں دہلی چلے آئے اور ان کی زندگی کا بیشتر وقت یہیں گزرا۔ یہاں انھیں مختلف امراء و رؤسا کی سرپرستی حاصل رہی۔ دہلی پر نادر شاہ کے پے در پے حملوں اور انتشار سے یہاں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا تو اپنی شکست خوردہ شخصیت سے مجبور ہو کر میرؔ لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے لئے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن اب وہ غمِ حیات سے بجھ چکے تھے۔ میر تقی میرؔ نے جب لکھنؤ کے سفر کا عہد کیا تو ان کے ساتھ کیا کیا مسائل پیش آئے، ان تمام کا ذکر انھوں نے اپنی تصنیف میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میرؔ میرے پاس آجائے تو اچھا ہو۔ چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق موتمن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے۔ ان قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب از راہ عنایت کچھ زادِ راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میرؔ صاحب یہاں آسکتے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا اور انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ جناب والا آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جس طرح ہوسکے آپ یہاں آجایئے میں پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ چونکہ خدا کی یہی مرضی تھی۔ میں بے یار و مددگار، بغیر قافلہ اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گزرا، وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے، انہوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہیں کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہوکر منزل مقصود پہنچ گیا۔''

(بحوالہ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ: صفحہ 98)

میرؔ کو لکھنؤ میں کچھ آسودگی میسر آئی۔ ایک بار نواب آصف الدولہ جب شکار کے لئے گئے تو میرؔ صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس کی یاد میں میرؔ نے ''شکارنامہ'' موزوں کیا۔ دوسری دفعہ نواب آصف الدولہ جب کوہِ شمال کے دامن تک گئے تو میرؔ نے دوسرا ''شکارنامہ'' لکھا اور ان کے حضور پیش کیا۔ اس شکارنامہ کی دو غزلوں کو آصف الدولہ نے بطور مخمس تضمین کی۔ میرؔ اس دور کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''اس زمانے میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔ یاروں کی ملاقات ترک کردی ہے۔ بڑھاپا آ پہنچا ہے اور عمر عزیز ساٹھ سال کی ہوگئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اٹھائی۔ ضعف بصری کی وجہ سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑوا دیا۔ غرض کہ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔''

(ماخوذ از ذکر میرؔ مرتبہ: مولوی عبدالحق۔ بحوالہ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، صفحہ 98)

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میرؔ کی زندگی مصائب و آزمائش سے عبارت تھی۔ آخری دنوں میں ان کی طبیعت خراب رہتی تھی اور بینائی کمزور ہوگئی تھی، دانتوں میں درد رہتا تھا اور زندگی سے وہ بے حد مایوس ہو چلے تھے۔ یہ وہ حالات تھے جو ان کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آئے، ویسے ان کی پوری زندگی مختلف آزمائشوں اور معاشی مشکلات میں گزری۔ کبھی بھی ان کو فارغ البالی میسر نہ ہوئی۔

میرؔ کے حالاتِ زندگی پڑھنے کے بعد وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ شروع ہی سے بہت خود دار تھے اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔ وہ کسی بھی رئیس یا امیر کے پاس حاضری نہیں دیتے تھے۔ وہ طبیعتاً آزاد تھے۔ حالانکہ ان

کی پوری زندگی آزمائشوں میں ہی گزری مگر پھر بھی وہ کبھی بھی ان مشکلات سے اس حد تک متاثر نہ ہوئے کہ ان کی اعلیٰ ظرفی پر حرف آسکے۔ بعض ناقدین، ان کو تنگ مزاج، نہ جانے کس بنا پر کہتے ہیں۔ جبکہ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ میرؔ نے اپنے غموں کی تشریح کچھ اس انداز میں کی۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں میرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ظاہر ہے میر تقی میرؔ کی ابتدائی زندگی یتیمی، بے کسی، اور ناداری میں گزری، ان کے سوتیلے بھائیوں نے بھی ان کو بہت پریشان کیا۔ ان حالات میں تلاش معاش میں انھیں مختلف شہروں کا چکر لگانا پڑا اور مسافرت میں مختلف قسم کی تکالیف کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تنگ دستی ان کی زندگی کا حصہ بنی۔ معاصرین کی تنقید کا نشانہ بنے۔ اپنوں نے ستایا اور دوسروں نے بھی انھیں تکلیف پہنچائی۔ عشق میں ناکام ہوئے۔ انانیت اور خودداری کی وجہ سے دہلی میں امرا اور روٴسا کے عتاب کا شکار ہوئے، لکھنو میں انھیں البتہ تھوڑا سکون ملا مگر تب وہ عمر کے آخری پڑاؤ پر تھے۔ عمر کے آخری ایام میں مختلف بیماریوں میں مبتلا رہے مگر آخری وقت تک ان کی خودداری، اعلیٰ ظرفی اور خود اعتمادی میں لغزش نہیں آئی۔ میرؔ کی ثابت قدمی میں استحکام تھا، جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑوں سے بھی مرعوب نہ ہوئے اور امیران وقت کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اگر یہ تمام غم ان کی زندگی کا حصہ نہ ہوتے تو شاید ان کی شاعری میں اتنی دلکشی، معنویت اور اثر پزیری نہ ہوتی اور نہ ہی ان کے عشق کے درد کا احساس دوسروں کو ہو پاتا۔ یہی تمام وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ان کی شاعری میں زندگی کی رمق اور حیاتِ انسانی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے اور انھیں موضوعات کی خوبصورت منظر کشی اور عام فہم انداز نے انھیں اردو شاعری میں وہ مقام عطا کیا جو کسی اور کو میسر نہ ہوا یہی وجہ ہے کہ ان کو 'خدائے سخن'' کہا جاتا ہے اور ان کے اشعار میں شورانگیزی تلاش کی جاتی ہے۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرؔ کی زندگی ایک مسلسل، مستقل اور مکمل المیہ تھی۔ جس کا کرب ان کے اشعار میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کی رمز شناسی، انسانی تجربات کی رنگا رنگی اور کائنات سے اس کے رشتے پر میرؔ کی عارفانہ نظر نے ان کی شاعری کو بصیرت آفرینی اور انسانی تجربے کی معنویت کا ادراک عطا کیا۔ میرؔ نے غزلوں کے علاوہ مثنوی، قصیدے، مراثی اور رباعیات میں بھی طبع آزمائی کی۔ مگر وہ اردو غزل کے امام کہلائے۔ غزلیات کے چھ دیوان، ایک فارسی کا دیوان، شعراء اردو کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اور خود نوشت بعنوان 'ذکر میرؔ'، ان کی یادگار ہیں۔

6.3.2 میر تقی میرؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات

میرؔ کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ میرؔ کی عظمتِ شاعری کے غالبؔ اور ذوقؔ بھی قائل ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں:

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ذوقؔ بھی کمالِ میرؔ کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میر کی زندگی مصیبت اور درد وغم سے عبارت تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف اتار چڑھاؤ اور تلخ وشیریں تجربات کیئے۔ ان تمام تجربات کا نچوڑ ان کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ شاعری میں زندگی کی عکاسی کے قائل ہیں اور ان کی شاعری اردو ادب کے سرمائے میں ایک روشن باب ہے۔ میر تقی میر کو آج تک اردو شاعری کی تاریخ میں ایک عظیم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں کہ ان کے اشعار سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ میر کی شاعری آپ بیتی نہیں جگ بیتی ہے۔ ان کی شاعری بول چال کی زبان میں ایسی پرکشش ہے کہ جی چاہتا ہے اسے بار بار پڑھا جائے۔ میر کی زندگی اور شاعری کے متعلق پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''میر نے اپنی زندگی تکلیف اور بدحالی میں گزاری تھی اس لیے انھیں اجڑی ہوئی دلی کی علامت کہنا غلط نہ ہوگا۔ صوفی منش باپ نے انھیں سکھایا تھا کہ دنیا میں محبت کے علاوہ کچھ نہیں، یہی زندگی ہے اور اس کے لوازم قناعت، بردباری، خودداری، اور غم کوشی ہیں۔ یہ باتیں ان کے اندر رچ بس گئی تھیں اور انھیں نے ان کی شاعری میں زندگی کی آگ پیدا کردی تھی۔ جب مصائب نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور بدحالی آخری حد کو چھونے لگی تو میر کی شخصیت میں ایک حیرت انگیز قسم کا بانکپن اور حسن پیدا ہوگیا۔ انھوں نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو انسانی توہین سے تعبیر کیا اور خدا سے بھی ناز سے پیش آئے۔ اس ذہن کے ساتھ نگاہِ محبت کا زخم بھی لگا جس نے شاعری کو آتش نوائی میں تبدیل کردیا اور آپ بیتی بنی نوع انسان کے دکھ درد کی ترجمانی کرنے لگی۔''
>
> (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ 70)

احتشام صاحب کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر ایک قناعت پسند اور متحمل مزاج شاعر تھے۔ انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو جھیلا اور اسی آگ میں تپتے ہوئے اپنی شاعری کو بھی نکھارا۔ انھوں نے کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ حالانکہ تنگ حالی نے انھیں ہمیشہ چاروں طرف سے گھیرے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری آپ بیتی نہیں جگ بیتی بن گئی۔ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کے درد و کسک کا اندازہ ہوتا ہے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمایش سراب کی سی ہے

ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

میرؔ کی سلاست اور سہل پسندی کی بات تقریباً سبھی ناقدین نے کی ہے کیونکہ میرؔ نے شاعری کو زبان کے لحاظ سے کبھی بوجھل ہونے نہیں دیا۔ سیدھی سادی بول چال کی زبان میں دلی جذبات کی اتنی نازک مصوری ایک معجزہ سے کم نہیں لگتا۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — کہ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
نہ مل میرؔ، اب کے امیروں سے تو — ہوئے ہیں فقیر، ان کی دولت سے ہم

میرؔ کی بیشتر تخلیقات اس وقت کی ہیں جب ان کی زندگی پریشانیوں میں گزر رہی تھی۔ اگر ان کے سامنے امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی تو تھوڑی دیر بعد وہ سراب ثابت ہو جاتی اور کم وبیش یہی حالت دہلی کی بھی تھی مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور مغلوں کی حیثیت عام آدمی کی سی ہو گئی تھی۔ شاعر جن حالات سے دوچار ہوتا ہے، اس کا عکس اس کے دل پر پڑتا ہے۔ چنانچہ میرؔ کی شاعری بھی انھیں حالات وحادثات کی عکاسی کرتی ہے، جو ان کی زندگی میں پیش آئے۔ اور جن سے ان کا واسطہ رہا۔ کہیں کہیں تو میرؔ صاف طور پر دہلی کا ماتم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر انھوں نے اس ماحول کی عکاسی کی ہے جو سماجی انحطاط کے نتیجے میں پیدا ہو رہا تھا۔

میرؔ کی شاعری کی شہرت ان کی زندگی ہی میں چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میرؔ نے اپنی شاعری کی بنیاد زندگی کے حقائق پر رکھی اور ان موضوعات کو اپنے لیے انتخاب کیا، جس کا براہ راست تعلق انسان کی زندگی سے ہوتا ہے۔ میرؔ نے زندگی کے انھیں حقائق کو پیش کر کے اپنی شاعری میں مقصدیت کو جگہ دی اور شعر کو ایک نیا مزاج و آہنگ بخشا۔ انسانی جذبات کی جس خوبصورت انداز میں منظر کشی ہمیں میرؔ کی شاعری میں ملتی ہے، کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ جیسا قد آور شاعر بھی میرؔ کی عظمت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکا:

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ کے علاوہ ذوقؔ نے بھی میرؔ کی شعری خصوصیات اور میرؔ کی شاعری کے محاسن کا اعتراف کیا ہے اور اپنے انداز میں بے باکانہ طور پر غزل میں میرؔ کی برتری کو تسلیم کیا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میرؔ کو اپنی عظمت کا احساس تھا، جابجا اپنے کلام پر فخر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

سارے عالم پر ہوں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز — تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میر تقی میرؔ نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے ان فطری جذبات و احساسات کو اپنے شعری قالب میں ڈھالا۔ جو ہر خواص و عوام کی فکری اور محسوساتی بساط ہوتی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں عبرت آمیز کلمات اور سبق آموز نصائح بھی ملتے ہیں جو زندگی کی حقیقتوں سے بالکل قریب ہوتے ہیں:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
سامان لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

میر تقی میرؔ دراصل جذبات کے شاعر ہیں۔ کوئی خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس خیال کو شعر کے قالب میں نہیں ڈھالتے بلکہ یہ خیال ان کے دل و دماغ میں گردش کرتا رہتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ احساس کے شعلوں میں تپتا رہتا ہے تب جا کے شعر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جیسے موت کے فلسفے کو بہت سے شعرا نے پیش کیا ہے مگر جب میرؔ نے موت کی حقیقت کو پیش کیا تو لوگ حیرت زدہ ہو گئے شعر ملاحظہ فرمائیں:

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میرؔ کا دوسرا شعر جس میں انھوں نے اپنی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اظہار کیا ہے:

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

یہی وجہ ہے کہ نور الحسن نقوی نے میرؔ کی شاعری کو عام فہم انداز میں گفتگو کرنے سے تشبیہ دی ہے۔ بول چال کی زبان میں جو شاعری کی جاتی ہے، وہی شاعری تادیر اثر قائم رکھتی ہے:

> ''میرؔ شعر نہیں کہتے، باتیں کرتے ہیں۔ وہ باتیں جو سننے والوں کو ایسی لگیں، جیسے پہلے سے اس کے دل میں موجود تھیں۔ انداز ایسا جیسے بے تکلف دوست اپنے دوست سے راز و نیاز میں محو ہو۔ لہجہ سرگوشی کا، زبان عام بول چال کی۔''

(اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ: صفحہ 30)

رام بابو سکسینہ نے بھی میرؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اوصاف کو بیان کیا ہے:

> ''میرؔ صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ان کے اشعار صاف، سادہ، فصیح اور تیر ونشتر کا کام دینے والے درد واثر سے مملو ہوتے ہیں۔ان میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔اظہار جذبات، چستی بندش اور ترنم میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ان کے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچی شاعری کا طرّ ائے امتیاز ہے۔زبان صاف و شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز کہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔وہ اردو کے شیخ سعدی ہیں۔ان کا کلام اکسیر شاعری ہے، علی الخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ان کے کلام میں جو حزن وملال، حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی ان کی شاعری کی جان ہے۔یہی ناامیدی اور یاس ان کی غزلوں کو زوردار اور مؤثر بناتی ہے''۔
>
> (تاریخ اردو ادب، صفحہ 107)

عام بول چال کی زبان میں میرؔ نے ایسا درد اور کرب بیان کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ان کی پوری زندگی ناکامیوں اور نامرادیوں سے عبارت ہے اور یہی ناکامی اور حرماں نصیبی ان کی شاعری میں پیوست ہوکر غم زمانہ بن جاتی ہے اور جب ان کی شاعری غم زمانہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمارے ضمیر کی آواز بن جاتی ہے، چونکہ میرؔ بچپن ہی سے بے یار ومددگار اور بے سہارا ہو گئے تھے۔شفقتوں سے محروم، شخص جب محبت کرتا ہے تو بے لوث و بے انتہا کرتا ہے چونکہ اس کی محبت کی ابتداء، انتہا سے شروع ہوتی ہے اس لئے دیرپا نہیں رہ پاتی۔میرؔ کی عشقیہ شاعری میں ناکامی ومحرومی کا شدید احساس موجود ہے۔کسی نے خوب لکھا ہے کہ ''میرؔ جب اپنی خون فشانی سے دامن پر گل کاریاں کرتے ہیں تو ان کا آرٹ بلند ترین مقام پر پہنچ جاتا ہے اور کائنات خود اس سے سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں''۔

میرؔ کی شاعری درد میں ڈوبی ہوئی ضرور ہے لیکن زہرناک نہیں۔ان کو انسان کی عظمت پر پورا بھروسہ ہے اور وہ اسے بہت اعلیٰ تصور کرتے ہیں۔یہ عرفان انھیں تصوف کے زیرِ اثر حاصل ہوا۔کئی بار میرؔ ناکام ہوتے ہیں، لیکن ہمت نہیں ہارتے اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔ان کے یہاں مصیبت میں بھی امّید کا پہلو نمایاں ہے اور محرومی میں غیرت وحمیت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ان کے کلام میں درد کی لو اور انسانیت کا پرتو موجود ہے۔میرؔ نے غمِ عشق کو جرات مندانہ کام سے تعبیر کیا اور غم آفاق اسکی آہنی ڈھال بتایا ہے، وہ ڈوب کر ابھر سکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی آگے چلنے کا عزمِ مصمم رکھتا ہے۔میرؔ نے اسی کو مردِ کامل اور انسانیت کی خصوصیاتِ اولین میں شمار کیا ہے۔ ناکامیوں کا ذکر کرتے ہوئے میرؔ لکھتے ہیں:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

انھیں خصوصیات سے مزین ہوکر میرؔ کی شاعری ایک آفاقی اور عالمی شاعری بن جاتی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں فکر کا عنصر غالب ہے جس میں جذبات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی حقیقت آب وتاب کے ساتھ موجود ہے جس میں ان کے احساسات و جذبات بھی یقیناً رہنمائی کرتے ہیں جیسے اگر کسی شیشے کے کارخانے کو دیکھ کر انھیں محسوس ہوتا ہے کہ پھونک مارنے میں ذرا سی لاپرواہی شیشے سے بننے والی شئے کو بگاڑ سکتی ہے۔ تو یقیناً ہماری تھوڑی سی بھی بد احتیاطی ہم کو تباہ کر سکتی ہے لہذا زندگی میں احتیاط کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ :

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

میرؔ کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جس موضوع کا بھی اپنی شاعری کے لئے انتخاب کرتے ہیں اس میں ایک خاص قسم کی معنویت اور اہمیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میرؔ کسی خاص نظریے کے حامل نہیں۔ زندگی میں پیش آنے والے ہر چھوٹے، بڑے واقعات ان کے دل پر اثر کرتے ہیں اور وہ ان کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر عشق کے تجربات نظر آتے ہیں اور یہ وہ تجربے ہیں جو ہر شخص کے دل پر کبھی نہ کبھی اثر انداز ضرور ہوتے ہیں اسی لیے میرؔ کی شاعری ہر انسان کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ میرؔ اپنی آپ بیتی سناتے ہیں مگر وہ جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:

''میر کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں جس کی مثال اس نشتر کی سی ہے جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اس کا اثر اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دل پر جا کر کھٹکتا ہے۔ میر کا رتبہ انیس سے بلند ہے کہ انیس رُلاتے ہیں میرؔ خود روتا ہے۔ یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگ بیتی۔''

میرؔ کی زبان ایسی ہے جیسے ایک آدمی دوسرے آدمی سے باتیں کرتا ہو، یعنی بول چال کی زبان میں ان کی شاعری بہت اثر انگیز ہوتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں پھول کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہیں:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

پیکر تراشی میں بھی میرؔ کو کمال حاصل ہے۔ یعنی لفظوں کے ذریعے خوبصورت تصویر بنانے کا ہنر میرؔ خوب جانتے ہیں۔ یہ ان کی فنکاری کی دلیل ہے اور ایک ایسا شعری وسیلہ ہے جس سے پورا منظر قاری کے سامنے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے دیکھی ہوئی چیز سنی ہوئی چیز سے زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ اسی لئے میرؔ کے کلام میں شعری پیکر جا بجا نظر آتے ہیں۔ جیسے :

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے

رات محفل میں تیری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

اس کے علاوہ میؔر شاعری کے لوازمات کو برتنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تشبیہ واستعارہ، مجاز مرسل، صنعت تلمیح کی بہت سی مثالیں ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں حسی اور جمالیاتی تجربات کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ ان میں ڈرامائی لطف پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی شاعری قاری کے باطن میں ''کتھارسس'' کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ میؔر کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو غزل کے لب و لہجے کو ایسی دلکشی کے ساتھ متعین کیا کہ آج بھی شعرا ان کی تقلید کو سرمایہ افتخار تصور کرتے ہیں۔ میؔر کا طرز ادا سادہ، عام فہم اور سلیس ہے، لیکن انھوں نے اکثر جگہ اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے ترکیبیں بھی تراشی ہیں۔ جو ابلاغ کو تکمیل اور ترسیل کو جامعیت عطا کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں ایک پرسوز اور دھیمی موسیقیت بھی کارفرما ہے، جس کی تخلیق میں لفظوں اور آوازوں کی تکرار اور طویل حروف علت کی بھرمار ہے۔ میؔر کی چھوٹی بحروں میں ان کا جذبہ شدید ہوگیا ہے اور اشعار تیرونشتر بن گئے ہیں۔ ایسے اشعار میں اظہار کے ایجاز واختصار نے بیان کو ارتکاز عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں نشاط غم کا تصور کارفرما ہے۔ ان کے کلام میں عشق کا ایک وسیع، ہمہ گیر اور آفاقی قدروں کا حامل تصور ملتا ہے۔ میؔر کے اشعار کی روانی، ترنم ریزی اور بے ساختگی اور سلاست ان کے کلام کی پہچان بن گئی ہے۔ انھوں نے ضائع اور بدائع سے زیادہ سروکار نہیں رکھا۔ لیکن ان کے کلام میں تلازموں کی دلکشی اور علامتوں کا حسن نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ میؔر کے کلام میں تشبیہات واستعارات کی ندرت ہے اور ان کی برجستگی بھی خوب ہے۔ میؔر ایک کامیاب مصور تھے۔ لفظوں سے تصویر بنانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی شاعری کے اہم اوصاف میں ان کی پیکر تراشی اور امیجری بھی ہے، جس نے ان کی مخصوص صورت گری میں معنویت اور اثر آفرینی پیدا کی ہے۔ غزلوں میں بصری پیکروں کی کثرت سے ان کی شاعری میں تلازمات کی جامعیت اور تشبیہات واستعارات کی دلنوازی نے ان کے اشعار کو نہ صرف صوری حسن عطا کیا ہے بلکہ ان کی معنوی قدر و قیمت میں بھی اضافہ کیا۔ ان کی غزلوں میں تجربے کی کسک، فطری انداز ابلاغ، بے ساختگی اور روانی ہے، جنھیں ان کے شعری اسلوب کی بنیادی خصوصیات کہہ سکتے ہیں۔

میر تقی میؔر نے غزلوں کے علاوہ مرثیہ نگاری سے بھی سروکار رکھا ہے جن کے مطالعے سے عزائیہ شاعری میں ان کا مقام متعین ہوتا ہے۔ مرثیوں میں حزنیہ اور سوز نا کی ان کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے۔ مراثی کے علاوہ انھوں نے تین قصیدے بھی لکھے ہیں، جو حضرت علی، حضرت امام حسین اور نواب آصف الدولہ کی شان میں ہیں۔ میؔر نے اپنے قصیدوں میں سوؔدا کی زمینیں استعمال کی ہیں۔ میؔر کی مثنویاں بھی بہت مشہور ہیں۔ شعلہ عشق اور دریائے عشق اردو مثنوی کے سرمایے میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ جذبات نگاری اور واقعات کا مسلسل بیان ان مثنویوں کو ادبی حسن عطا کرتا ہے۔ میؔر نے ایک تذکرہ ''نکات الشعرا'' بھی لکھا ہے جو اردو کے اولین تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔

اس میں قابلِ قدر تنقیدی شعور دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے شعرا کے کلام پر اپنا دوٹوک فیصلہ سنایا ہے۔ اس تذکرے میں شاکر ناجیؔ، خان آرزوؔ، سوداؔ اور مظہرؔ جانِ جاناں کے قابل ستائش مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ میرؔ نے اپنے تذکرے میں حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ماحول اور ادبی تناظر کی طرف بھی بلیغ اشارے کئے ہیں۔

6.3.3 متن اور اس کی تشریح

I غزل

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے، اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماری دل کی، رسم شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی ،اس درد کا چارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت، ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ، رمز و اشارہ جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ دیکھے سے جی اٹھتا ہے
یار کے آجانے کو یکا یک، عمر دوبارہ جانے ہے

کیا کیا فتنے؟ سر پر اس کے ، لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل، بے تاب وتواں کو عشق کا مارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا؟ میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس نے ، آبِ گوارا جانے ہے

اشعار کی تشریح:

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے   جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

میر تقی میرؔ کو غم کا ترجمان کہا جاتا ہے ان کے عشق کے تصورات مختلف ہیں، ان کے یہاں عشق کے داخلی کیفیات کے اظہار میں شدت ہے۔ اس شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ میری حالتِ زار کے متعلق باغ کے پتے، بوٹے اور ہر جھوٹے بڑے درخت جو باغ میں موجود ہیں، آگاہ ہیں۔ لیکن ایک پھول باغ کا ایسا ہے جو میری حالت سے بے خبر ہے۔ شاعر نے باغ پتا پتا، بوٹا بوٹا کہہ کر استعاراتی انداز میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ میں جہاں رہتا ہوں اس کے آس پاس کے بچے، جوان اور بوڑھے سبھی میری عشق کی کیفیت سے آگاہ ہیں اور ہماری، عشق میں

کیا بری حالت ہورہی ہے اس سے سبھی لوگ واقف ہیں۔لیکن جس شخص کو میری اس کیفیت کا احساس ہونا چاہئے وہ میری حالت سے بے خبر ہے۔یعنی میرا محبوب میری محبت کی تڑپ سے بے خبر ہے۔شاعر نے یہاں پتا بوٹا اور باغ کہہ کر اپنے آس پاس کے افراد کو مراد لیا ہے اور''پھول'' کہہ کر اپنا محبوب مراد لیا ہے، جس سے وہ عشق کرتا ہے۔اس شعر میں شاعر نے لفظوں کے انتخاب میں نہایت چابکدستی اور دوراندیشی سے کام لیا ہے۔ اپنی بات براہ راست نہ کہہ کر پھولوں اور پتوں کے پردے میں استعاراتی انداز میں بیان کیا ہے۔میرؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر براہِ راست بات نہ کر کے استعاراتی انداز میں اپنی بات کو بیان کرتے ہیں جس سے شعر کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں　　　جی کے زیاں کو عشق میں اس کے، اپنا وارا جانے ہے

شاعر کہتا ہے کہ عاشق جیسا سادہ لوح اور بھولا بھالا انسان تو شاید ہی دنیا میں کوئی ہو، جو نقصان کا سودا کر کے خوشی و مسرت محسوس کرتا ہے۔اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق ایک ایسا حیوان ناطق ہے جو عشق میں سب کچھ قربان کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اپنی جان قربان کر دینے کو بھی تیار رہتا ہے اور اپنی اس قربانی کو وہ نفع سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ جان جیسی قیمتی شئے کے زیاں کو بھی فائدہ مانتا ہے۔ یہاں زیاں سے مراد نقصان اور وارا کا مطلب نفع ہے۔ میرؔ نے اس شعر میں عاشق کی کیفیت نہایت مختصر لفظوں میں خوبصورتی سے بیان کر دی ہے۔شعر کی قرأت سے اس کی روانی اور سلاست کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے اور اس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے اسکا بھی پتہ چلتا ہے۔

چارہ گری بیماری دل کی، رسم شہرِ حسن نہیں　　　ورنہ دلبر ناداں بھی، اس درد کا چارا جانے ہے

شاعر کہتا ہے کہ میں جس شہر میں رہتا ہوں۔اس شہر کے لوگوں میں بیماروں کی عیادت اور مزاج پرسی کی رسم نہیں ہے۔سبھی اپنے آپ میں مگن ہیں۔اگر درد کا احساس یہاں کے لوگوں کو ہوتا تو اسی شہر میں میرا محبوب بھی رہتا ہے وہ بھی اس درد کی چارہ گری کو جانتا۔مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس شہر نامراد میں ہر شخص بے حس ہے۔ یہاں شہر سے مراد دنیا ہے اور اس دنیا میں رہنے والے عشق کی رسم پر یقین نہیں رکھتے وہ عشق کی کیفیات سے محروم ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا نادان دلبر میرے عشق کی کیفیت سے ضرور آگاہ ہوتا، اور اس کی طرف سے کچھ نہ کچھ جواب بھی ضرور آتا، اسکی تساہلی میں اسکا اپنا کوئی رول نہیں دنیا نے اسے بے حس بنا دیا ہے۔

مہر و وفا و لطف و عنایت، ایک سے واقف ان میں نہیں　　　اور تو سب کچھ طنز و کنایہ، رمز و اشارہ جانے ہے

اس شہر کے لوگ انسانی اقدار سے محروم ہیں نہ ان کے پاس وفاداری ہے اور نہ مروت، نہ ہی لطف و عنایت ہے اور نہ مہربانی کی صفت سے متصف ہیں۔ ہاں ان لوگوں کو ایک ہنر ضرور آتا ہے وہ یہ کہ عاشق پر طنز کرنا بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ جب عاشق، عشق کی آگ میں جلتا ہے اور عشق کی داخلی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اور اس وقت جو اس کے چہرے پر تاثر پیدا ہوتا ہے (بے خودی کی کیفیت) تو اس کیفیت کو دیکھ کر یہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں اور عاشق صادق پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔کوئی طنز کرتا ہے کوئی کنایہ اور رمز و اشارہ کے ذریعہ سیدھا اس پر

نشانہ سادھتا ہے۔ شاعر نے اس شعر میں ایک طرف انسانی قدروں کی بنیادی صفات گنائی ہے تو دوسری طرف انسانوں کے ذریعے مطلوبہ شخص پر مختلف طریقے سے طنز کیے جانے کے لئے جو طریقے اور جو صنعت استعمال کی جاتی ہے اسے بھی نہایت عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔ اس شعر میں دنیا کی پوری حقیقت اور انسانوں کی فکری اور فطری جبلت کا اظہار بھی موجود ہے۔

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ دیکھے سے جی اٹھتا ہے　　　یار کے آجانے کو یکایک، عمر دوبارہ جانے ہے

اس شعر میں میرؔ نے عاشق کی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جو اس پر ہمہ وقت طاری رہتی ہے۔ یعنی ہمیشہ دم بے خود، مبہوت، خمار آلودہ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتا ہے۔ یعنی اس کی حالت ایک مُردے کی سی رہتی ہے، جس میں زندگی کی رمق نظر نہیں آتی۔ مگر جب بھی وہ اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو نشے سے باہر آجاتا ہے۔ یعنی وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے آجانے سے اچانک اس کے جسم میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب مجھے دوبارہ زندگی مل گئی ہے۔ میرؔ نے اس شعر میں عاشق کی کیفیت بالکل مختلف انداز سے بیان کی ہے اکثر شعرا کے یہاں یہ تو ملتا ہے کہ جب عاشق کی اپنے محبوب سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ کیا کہتا ہے اور کیا بھول جاتا ہے، لیکن میرؔ نے اس کی زندگی کو موت سے تعبیر کی ہے اور محبوب کی اس کے سامنے آمد کو یکایک زندگی بتایا ہے جو اسے دوبارہ مل جاتی ہے۔ یہی تو بڑے شاعر کا کمال ہے کہ وہ ایسے نکات پیش کرتا ہے جس میں دنیا کی پوری حقیقت صرف ایک مصرعے میں سمٹ جاتی ہے۔ اس شعر میں مردے کا جی اٹھنا اور دوبارہ زندگی مل جانا، ان تینوں کیفیات کا اظہار بہت ہی عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے۔

کیا کیا فتنے؟ سر پر اس کے، لاتا ہے معشوق اپنا　　　جس بے دل، بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

اس شعر میں میرؔ نے اس کیفیت کی جانب اشارہ کیا ہے، جس سے عاشق دوچار ہوتا ہے۔ یعنی نہ جانے کون کون سے فتنے، کون کون سی مصیبتیں محبوب اپنے عاشق کے لئے لے کر آتا ہے اور یہ فتنے ایک ایسے شخص پر ڈالتا ہے جو فطری طور پر ناتواں، کمزور اور بے جان ہوتا ہے۔ اس کے پاس اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ ان تمام فتنوں کو برداشت کر سکے کیونکہ وہ نحیف اور کمزور ہے مگر اس کا محبوب اس بات سے بالکل بے خبر ہے۔

عاشق کے دل پر کیا گزرتی ہے اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا ہے۔ بس اپنی اداؤں سے اسے مجروح کرنا جانتا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ عاشق کی حالت بڑی قابل رحم ہوتی ہے، اس پر پہلے ہی سے ہجر کے غم کا پہاڑ ٹوٹتا رہتا ہے، اوپر سے محبوب کے مختلف انداز کے فتنے، مصیبت بالائے مصیبت ثابت ہوتے ہیں۔

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا؟ میرؔ بھی ناداں تلخی کش　　　دم دار آبِ تیغ کو اس نے، آبِ گوارا جانے ہے

اس شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ محبوب کے ظلم کی انتہا نہیں ہے وہ ہمارے خون کا پیاسا ہے۔ وہ اپنے محبوب کی تیز تلوار کی دھار کو ایک آبِ گوارہ تصور کرتے ہیں۔ یعنی اس تلوار میں جو تیز دھار ہے اسے آب گوارہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی اسے قبول کر لینے کو آب گوارہ بتایا ہے۔ میرؔ اس کے تیغ و ظلم کی دھار کو بخوشی گوارہ کرنے کو تیار ہیں۔ کیونکہ اس کی نظر میں عشق کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے کہ وہ محبوب کی تلوار کا نشانہ بن جائے۔ یہی عاشق کے عشق کی معراج ہے۔

غزل II

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا ،کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
میر!ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اشعار کی تشریح:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　　　یہ نمائش سراب کی سی ہے

میر تقی میر کی یہ غزل چھوٹی بحر میں ہے اور غزل کے ہر شعر میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے۔ میر نے اس غزل میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ متن اور متن سے الگ معنی کی کئی پرتیں لئے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہستی اپنی حباب کی سی ہے۔ اس مصرعے میں ہستی اور حباب دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہستی کے معنی زندگی اور حباب کے معنی بلبلا کے ہوتے ہیں دونوں میں جو ایک صفت قدر مشترک ہے وہ فنائیت ہے یعنی ہستی اور حباب کی تکمیل موت ہے دونوں کی زندگی عارضی ہے اور خاتمہ ان کا مقدر ہے۔ یہ نمائش سراب کی سی ہے۔ نمائش، دکھاوا۔ نام ونمود اور سراب دھوکا۔ یہ دنیاوی زندگی دکھاوا اور نام ونمود کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ دکھاوا ایک دھوکا ہے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

شاعر محبوب کے لب یعنی ہونٹ کی تشبیہ گلاب کی پنکھڑی سے دے رہا ہے کہ محبوب کے ہونٹ گلاب کی مانند یا گلاب کی طرح نرم ونازک ہیں۔ یعنی محبوب کے نرم و نازک ہونٹ گلاب کی پنکھڑی کے مانند ہیں۔ لب اور گلاب میں کئی اوصاف ایک سے ہیں جیسے دونوں مادی ہیں خوبصورت، حسین اور دل کش ہیں۔

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں　　　　حالت اب اضطراب کی سی ہے

عاشق کی اضطرابی کیفیت ،اس کی بے اطمینانی ، بے سکونی ، بے چینی کی حالت اس وجہ سے ہے کہ وہ متواتر ،لگاتار، گھڑی گھڑی اپنے محبوب کے گلی محلے اور دیوار و در کی خاک چھان رہا ہے۔ لیکن محبوب کا دیدار میسر نہیں ہوا۔ یا اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں محبوب کے دیدار کے لئے دل بے چین رہتا ہے اس وجہ سے اس کے دیار کا بار بار چکر لگاتا ہوں۔ تاکہ وہ میرے حال پر رحم کھا کر مجھے تسلی دینے کے لئے باہر نکلے۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز   اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرا نالہ، میری آہ و بکا، سن کر محبوب نے آواز پہچان کر کہا کہ یہ صدا، یہ آواز تو کچھ سنی، سنی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ کہیں یہ آواز اس دیوانے کی تو نہیں جس نے میرے پیار میں اپنا گھر بار اپنی ہنستی کھیلتی دنیا برباد کر دی۔

میر! ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

نیم باز کے معنی آدھا کھلا اور آدھا بند کے ہیں۔ شاعر اپنی محبوبہ کی خوابیدہ اور نیم خوابیدہ آنکھوں کا ذکر کر رہا ہے۔ جس میں شوخی و مستی ہوتی ہے ایسی مستی جو اپنے چاہنے والے کو مسحور کر دے۔

6.4 آپ نے کیا سیکھا

- اس اکائی میں ہم نے جانا کہ
- میر تقی میرؔ آگرہ میں پیدا ہوئے، دہلی میں سکونت اختیار کی اور جب یہاں کے حالات خراب ہوئے تو نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنو چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا
- میرؔ کی پوری زندگی بڑی اذیتوں اور پریشانیوں میں گزری۔ ان کا دور بہت پُر آشوب دور رہا ہے۔ وہ بہت قناعت پسند اور صوفی منش انسان تھے۔
- میرؔ کی شاعری میں ذاتی کرب اور سیاسی و سماجی ماحول کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا اسی لئے آج بھی وہ اردو غزل کے چند نمائندہ شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔
- میرؔ نے محاوروں اور کہاوتوں کو نئے معنی اور نئے مفہوم کے ساتھ استعمال کیا۔
- میرؔ نے چھ 6 دیوان اردو میں، ایک فارسی میں یادگار چھوڑا۔ ذکرِ میرؔ اور نکات الشعرا، ان کی مشہور نثری تصانیف ہیں۔

6.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1- میرؔ کی زندگی اور ان کے عہد پر ایک پیرا گراف لکھیے؟

2- میرؔ کے عہد کے اہم شعرا کے نام بتائیے؟

3- میرؔ کو خدائے سخن کیوں کہا جاتا ہے؟

4- میرؔ نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا؟ دو لائن میں لکھیے

5- میرؔ کے دو شعر کی تشریح کیجیے؟

I عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں   جی کے زیاں کو عشق میں اس کے، اپنا وارا جانے ہے

II بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں   حالت اب اضطراب کی سی ہے

6.6 سوالات کے جوابات

-1 میر تقی میرؔ آگرہ میں 1722ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت، والد اور منھ بولے چچا سید امان اللہ کے زیر سایہ ہوئی، وہ قلندرانہ مجاز رکھتے تھے۔ زندگی بہت تنگی اور عُسرت میں بسر ہوئی۔ ان کے عزیزوں اور رشتے داروں نے بھی انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ روزگار کی تلاش میں دہلی اور لکھنؤ سے وابستہ رہے۔ 1810 میں لکھنو میں ان کا انتقال ہوا۔ میرؔ کا دور بہت پُر آشوب دور رہا۔ سیاسی اور سماجی اعتبار سے بہت اُتھل پتھل دیکھنے کو ملی۔ مغلوں کا زوال ہو رہا تھا۔ مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں، روہیلوں اور بالآخر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ سب میرؔ کے سامنے ہوا، اس کا گہرا اثر انکی زندگی پر پڑا۔

-2 میرؔ کے عہد میں خوجہ میر دردؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ کے علاوہ میر سوزؔ، تاباںؔ، یقینؔ، قائمؔ، اور مرزا مظہرؔ جانِ جاناں کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

-3 میرؔ نے اپنے کلام بالخصوص غزل کو اردو شاعری کے ابتدائی دور میں ہی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ آج بھی ان کا شمار اردو کے چند نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے اور شعراء اردو کا خیال ہے کہ ان کے کلام کی پیروی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے مگر جس طرح کلام اللہ کی پیروی نہیں کی جا سکتی اسی طرح کلامِ میرؔ کا جواب لکھنا بھی ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔

-4 میرؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے ذاتی رنج و غم کو آفاقیت عطا کی۔ ان کی شاعری کا جو بھی مطالعہ کرتا ہے اسے اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اسی لئے ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے ''آپ بیتی کو جگ بیتی'' بنا دیا۔

-5 میرؔ کے دو شعر کی تشریح

I عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں　　جی کے زیاں کو عشق میں اس کے، اپنا وارا جانے ہے

شاعر کہتا ہے کہ عاشق جیسا سادہ لوح اور بھولا بھالا انسان تو شاید ہی دنیا میں کوئی ہو جو نقصان کا سودا کر کے خوشی و مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق ایک ایسا حیوان ناطق ہے جو عشق میں سب کچھ قربان کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اپنی جان قربان کر دینے کو بھی تیار رہتا ہے اور اپنی اس قربانی کو وہ نفع سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ جان جیسی قیمتی شئے کے زیاں کو بھی فائدہ مانتا ہے۔ یہاں زیاں سے مراد نقصان اور وارا کا مطلب نفع ہے۔ میرؔ نے اس شعر میں عاشق کی کیفیت نہایت مختصر لفظوں میں خوبصورتی سے بیان کر دی ہے۔ شعر کی قرأت سے اس کی روانی اور سلاست کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے اور اس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔

II بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں   حالت اب اضطراب کی سی ہے

عاشق کی اضطرابی کیفیت ،اس کی بے اطمینانی ، بے سکونی ، بے چینی کی حالت اس وجہ سے ہے کہ وہ متواتر ،لگاتار،گھڑی گھڑی اپنے محبوب کے گلی محلے اور دیوار و در کی خاک چھان رہا ہے۔لیکن محبوب کا دیدار میسر نہیں ہوا۔یا اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں محبوب کے دیدار کے لئے دل بے چین رہتا ہے اس وجہ سے اس کے دیار کا بار بار چکر لگاتا ہوں۔تاکہ وہ میرے حال پر رحم کھا کر مجھے تسلی دینے کے لئے باہر نکلے۔

6.7 فرہنگ

اوصاف	وصف کی جمع خوبیاں
مخمس	وہ نظم جس میں ہر بند پانچ مصرعوں کا ہو
دل شکستگی	رنجیدگی ،افسردگی ، مایوسی
بصارت	قوتِ بینائی ، دیکھنے کی طاقت
فارغ البالی	آسودگی ،اطمینانی کیفیت
ناقد	تنقید کرنے والے
فراغ	فرصت ،نجات ،سکھ
رمق	تھوڑی سی جان ،اخیر سانق ، ذرا سا ، چاشنی کا کچھ اثر
صناع	کاریگر ، ہنرمند ، فنکار
تلمیح	ایسی صنعت جس میں کسی تاریخی واقعے کا ذکر ہو
بوٹا	گلکاری ، جھاڑ ، پھول پتّی
زیاں	نقصان ۔گھاٹا
چارہ گری	کام بنانے والا ، کام کرنے والا ، معالج
وارا	بچت ، کفایت ، فائدہ ، نفع ، بیماری سے افاقہ
عنایت	مہربانی ، توجہ ،التفات
رمز و اشارہ	آنکھوں بھوؤں سے اشارہ کرنا۔اشارہ
تشنہ	پیاسا ، مشتاق
بے تاب و تواں	کمزو ، نحیف ، جو بوجھ نہ اٹھا سکے

تلخی کش	مصائب برداشت کرنے والا
آب تیغ	تلوار کی دھار
داخلی کیفیات	دلی جذبات واحساسات
دنیاو مافیہا	دنیا اور جو کچھ اس میں ہے
حباب	پانی کا بلبلہ
سراب	دھوکہ
در	چوکھٹ، دروازہ
اضطراب	بے قراری، بے چینی
مضمحل	کمزور، لاغر، اداس، رنجیدہ
خانہ	گھر
عُسرت	غربت، تنگی

6.8 کتب برائے مطالعہ

1. انتخاب کلامِ میؔر — مولوی عبدالحق
2. ذکرِ میؔر (اردو ترجمہ) — نثار احمد فاروقی
3- میؔر حیات اور شاعری — خوجہ احمد فاروقی
4- میؔر کا رنگِ طبیعت — ڈاکٹر سید عبداللہ
5- محمد تقی میؔر — ڈاکٹر جمیل جالبی
6- میؔر اور ہم — مجنوں گورکھپوری
7- شعر شور انگیز — شمس الرحمان فاروقی
8- اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — پروفیسر احتشام حسین
9- اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی
10- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ — سنبل نگار

اکائی 7 خواجہ میر دردؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 خواجہ میر دردؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

7.3.1 خواجہ میر دردؔ کے حالاتِ زندگی

7.3.2 خواجہ میر دردؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات

7.3.3 متن اور اس کی تشریح

I غزل

II غزل

7.4 آپ نے کیا سیکھا

7.5 اپنا امتحان خود لیجئے

7.6 سوالات کے جواب

7.7 فرہنگ

7.8 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے اغراض ومقاصد ہیں:

- غزل کی صحیح قرأت کی مشق
- غزل کی لفظیات اور اس کے شعری محاسن سے واقفیت
- خواجہ میر دردؔ کے حالاتِ زندگی سے واقفیت
- خواجہ میر دردؔ کے عہد کو سمجھنا
- خواجہ میر دردؔ کی دوغزلوں کی تفہیم وتشریح
- کلاسیکی غزل، خصوصاً صوفیانہ کلام سے واقفیت

7.2 تمہید

اردو کا شعری سرمایہ خاصا وقیع اور متنوع ہے۔ اردو کی شعری اصناف میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہے، وہ کسی اور صنف سخن کو میسر نہیں۔ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے اور ہماری مشترکہ تہذیب اور عصری زندگی کے معاملات ومسائل کا ترجمان بھی۔ غزل کے اثرات اردو کے علاوہ دیگر ہندوستانی زبانوں نے بھی قبول کیے۔

ابتدا تا حال اردو غزل کا جادو ہر عہد میں سر چڑھ کر بولتا رہا خواہ اسے کلاسیکی یا روایتی، ترقی پسند اور جدید کا نام دیا گیا ہو۔ اردو شاعری کی تقسیم ادوار کے اعتبار سے بھی کی گئی ہے۔ لہٰذا اسے متقدمین، متوسطین، متاخرین اور جدید شعرا کے زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کی شاعری اپنے عہد کے حالات و رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ اور اپنا ایک مخصوص مزاج، معیار اور آہنگ رکھتی ہے۔

اردو غزل کو اس کی ہیئت، رمز و ایما اور ایجاز و اختصار کی وجہ سے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ موضوعات کی رنگا رنگی اور تنوع اس کی مقبولیت کا سبب ٹھہرے۔ غزل نے عصری مسائل کو بیان کیا، غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اپنے اندر معنیاتی اکائی رکھتا ہے۔ دورِ قدیم میں قلی قطب شاہ، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، جعفر زٹلی، آبرو، قائم، حاتم اور کلاسیکی دور میں سودا، میر تقی میر اور میر درد بہت مقبول ہوئے۔

خواجہ میر درد اردو کے معتبر، منفرد، قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کا شمار اردو کے کلاسیکی شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے جس میں انھوں نے اپنی فکر و فن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔

درد کی شاعری دراصل وارداتِ قلبیہ کا بیان ہے جو دل سے نکلتی اور دل میں اتر جاتی ہے۔ تصوف اور عشق حقیقی ان کا اصل موضوع ہے۔ انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے قلبی جذبات و احساسات کو متاثر کن انداز میں نہایت سادگی سے پیش کیا۔ کلامِ درد میں خیالات کی پاکیزگی، فکر کی گہرائی، تصور کی چاشنی، زبان کی سادگی اور اظہار بیان کی خوش سلیقگی نمایاں ہے۔

7.3 خواجہ میر درد کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

7.3.1 حالاتِ زندگی

خواجہ میر درد کا شمار اردو کے ان ممتاز شعراء میں ہوتا ہے جن کو اپنے فکر و فن سے شہرت حاصل ہوئی، شخصی پاکیزگی اور روحانیت کے سبب مقبولِ عام ہوئے۔ ان کا اصل نام سید خواجہ میر تھا اور درد تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر کا شمار روحانی بزرگوں میں ہوتا تھا۔ وہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ ان کے خاندان میں پیری و مریدی کا سلسلہ عرصۂ دراز سے چلا آ رہا تھا۔ اسی روح پرور ماحول میں درد کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ انھیں مذہبی اور شعری ذوق وراثت میں ملا تھا۔ درویشانہ ماحول اور صوفیانہ تربیت نے بچپن ہی سے تصوف و روحانیت کو ان کی فطرت کا حصہ بنا دیا تھا۔ بائیس برس کی عمر میں درد اپنے والد کے سجادہ نشین بن گئے اور تصوف ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ میر تقی میر نے 'نکات الشعراء' میں درد کی شخصیت کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> ''درد بزرگ ہیں اور بزرگ کے بیٹے ہیں جوان صالح ہیں۔ درویشی میں انھیں بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔
> مجھ فقیر کو ان کا خاص قرب اور عقیدت حاصل ہے۔ ویسے ان کا حسن سلوک ہر ایک کے لئے عام ہے۔
> انھوں نے دنیاوی عزت کی خواہش کو دل سے نکال دیا ہے''۔
>
> (خواجہ میر درد، ظہیر احمد صدیقی صفحہ 19)

درد نے تصوف اور روحانیت کے موضوع پر اردو اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ فنِ موسیقی اور راگ سے بھی ان کو شغف تھا درد کی موسیقی سے دلچسپی کے متعلق پروفیسر قاضی جمال حسین لکھتے ہیں:

''خواجہ میر دردؔ موسیقی سے اپنی دلچسپی کے متعلق خود کہا کرتے تھے کہ نغمہ وسرود کو میں نہ تو فاسقوں، فاجروں کی طرح سنتا ہوں جو مجازی محبوبوں کے تصور میں دیوانے ہوتے ہیں اور کانوں کی لذت پر اکتفا کرتے ہیں اور نہ ہی ان مغلوب الحال صوفیا کی طرح جو چنگ ورباب کی فقط دلکش آوازوں پر سر دھنتے ہیں۔ بلکہ جس طرح اہل علم مختلف طبیعی علوم کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اوراس کی باریکیوں کو خوب جانتے ہیں، مگر علماء کی طرح دل سے اس پر اعتقاد نہیں رکھتے ہیں۔ اس طرح موسیقی کے ساتھ شغل کرتا ہوں کیونکہ موسیقی ریاضی کی ایک پر میوہ شاخ ہےاور طرفہ لطف واثر رکھتی ہے''

(خواجہ میر درد صفحہ 37)

فن موسیقی کے بارے میں خواجہ میر دردؔ نہ صرف اچھی معلومات رکھتے تھے بلکہ وہ اس کے ایک ماہر استاد تھے اور بڑے بڑے موسیقار بغرضِ اصلاح ان کے پاس حاضر ہوتے تھے ان کی قناعت پسندی اور شان استغنا نے دربار شاہی کے قُرب کو گوارہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود ان کی خانقاہ کو شاہی دربار سے مالی اور دیگر امداد ملتی رہی۔ دردؔ کے معاصرین نے بھی ان کے شعری کمال، تبحر علمی اور روحانیت کا اعتراف کیا ہے۔لیکن دردؔ کی ملک گیر شہرت میں ان کی شاعری کے علاوہ مریدوں کی ایک کثیر تعداد کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔

خواجہ میر دردؔ کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑی افراتفری اور ہنگامہ آرائیوں کا تھا،مختلف بہانوں سے دلی تباہ و برباد کی جاتی رہی۔ بیرونی حملوں سے آئے دن لوٹ مار کا بازار گرم رہتا تھا۔غذا اور اشیائے خوردنوش کی قلت سے لوگوں کا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔لوگوں کے کاروبار تباہ ہو گئے تھے۔ملازمتوں کے دروازے تقریباً بند ہو گئے تھے۔دربار شاہی کا وقار مجروح ہو چکا تھا۔حکام وقت عیش وعشرت کی زندگی میں اس حد تک ڈوبے ہوئے تھے کہ انھیں عوام کی پرواہ ہی نہ تھی۔ روز بروز کی مشکلات سے تنگ آکر اکثر امراء، شرفاء اور ارباب کمال، اپنی جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی غرض سے گھر بار چھوڑ کر دوسرے شہروں میں جا بسے تھے۔لیکن ان حالات میں بھی دردؔ کے پایۂ استقلال کو جنبش نہ آئی اور انھیں اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے دلی چھوڑنے کا خیال تک نہ آیا۔اور یہیں 1785ء میں چونسٹھ سال کی عمر میں، اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور دہلی ہی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

7.3.2 خواجہ میر درد کی غزل گوئی کی خصوصیات

خواجہ میر دردؔ کا بیشتر کلام غزل کی فارم میں ہے،تصوف کے اسرار ورموز کے ساتھ زبان رواں اور سلیس ہے۔اپنے تخلص دردؔ کی ہی طرح ان کی شاعری میں بھی وہی مغموم فضا اور دردمندانہ لہجہ موجود ہے۔ان کی شعری زبان میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔دہلی کی ٹکسالی زبان میر تقی میرؔ کے بعد دردؔ ہی کی شاعری میں ملتی ہے۔اس زمانے کے بیشتر تذکرہ نگاروں، شاعروں اور ادیبوں نے دردؔ کو اردو کا اہم شاعر تسلیم کیا ہے۔

دردؔ کا شعری سرمایہ قلیل ہے،جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ان کی بیشتر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔لیکن تاثیر سے پُر ہیں جس کے بارے میں محمد حسین آزاد کو کہنا پڑا کہ دردؔ کی شاعری نے تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے۔اور امیرؔ مینائی جیسے شاعر کو کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ دردؔ کا کلام کیا ہے پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ویسے تو غزل خود ہی کم الفاظ میں شاعر کے مافی ضمیر کی ادائیگی کا نام ہے اس پر چھوٹی بحروں میں الفاظ اور بھی کم ہو جاتے ہیں۔چنانچہ چھوٹی بحروں میں شعر کہنا بڑی بحروں کے مقابلے میں زیادہ دشوار ہوتا ہے،لیکن اس

مشکل کو دردؔ بہ آسانی حل کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری تصوف کے اسرار و رموز سے بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے عشق حقیقی کو مجازی شکل میں دیکھا۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں حسنِ یار کی بے ساختہ اداؤں کی جھلک اس طرح ملتی ہے جو عام طور پر ان کے معاصرین میں مفقود ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ صوفی ہونے کے باوجود وہ زندگی سے بیزار نہیں تھے بلکہ اسے خدا کا بیش بہا عطیہ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں محبت کے گوں ناگوں جذبات کو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ اس عہد میں عشق و عاشقی رسمی طور پر بھی شاعری کا لازمی حصہ بن چکی تھی لیکن دردؔ کے یہاں یہ عشق زیادہ فطری اور زیادہ حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ وہ محبوب کے خط و خال کا بیان بڑی فن کاری سے کرتے ہیں۔ چنانچہ اس انداز کے شعر ان کے یہاں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

عَرَق کی بوند اُس کی زلف سے رخسار پر ٹپکی
تعجب کی ہے جاگہ یہ پڑی خورشید پر شبنم

میں سامنے سے جو مسکرایا
ہونٹ اس کا بھی دردؔ ہل گیا تھا

دردؔ کی شاعری کا محور عشق ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جو باتیں کی ہیں ان سب کا تعلق اسی جذبے سے ہے۔ یہ عشق حقیقی بھی ہے اور مجازی بھی۔ ان کے نقطہ نظر سے ذات خداوندی، انسانی عظمت اور فنا و بقا سب اسی عشق حقیقی کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان کا عشق دوسرے شعرا کی طرح محض ماورائی اور مافوق الفطری نہیں ہے۔ عشق نے ان کے دل میں جو گداز، دردمندی اور نرمی پیدا کی، اس کے نتیجے میں نہ صرف ان کے یہاں انسانی درد نمایاں ہے بلکہ ان کا سماجی شعور بھی پختہ ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی انتشار اور آشوب روزگار سے پہلو تہی نہیں کی۔ یہ المیہ بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہوا ہے اور درد و کرب کے ایسے مناظر بھی ان کی شاعری کا حصہ بنے ہیں۔

شب خوں لیے فلک پھرے ہے
کھینچے ہوئے تیغ، کہکشاں سے

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

خواجہ میر دردؔ کی زندگی عبادت و ریاضت اور سچی خدا پرستی سے معمور تھی۔ ان کا کلام ان کی طبیعت اور مزاج کا شفاف آئینہ ہے۔ انھوں نے نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہا، نہ کسی کی ہجو لکھی، نہ کوئی عشقیہ مثنوی کہی، جو اس زمانے کا عام رواج تھا۔ ان کا کلام صرف غزلوں تک محدود ہے، ان غزلوں میں ان کی عقیدت، پاکیزگیِ روح اور عشق الٰہی کی جلوہ گری ہے۔ خیالات کی بلندی، نفاست بیان اور تصوف کی چاشنی ان کے کلام کا جزو لازم ہے۔ ان کی زبان بہت صاف، نرم اور سلیس ہے۔ چھوٹی بحروں میں ان کی غزل گوئی کا کمال، طبیعت کے گہرے رچاؤ کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ دردؔ کی شاعری کی خصوصیات سے متعلق پروفیسر قاضی جمال لکھتے ہیں

''اردو شعراء میں دردؔ کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا ایک منضبط فکری نظام ہے جو ان کی شاعری اور نثری

تحریروں کو ایک وحدت عطا کرتا ہے۔صوفیانہ تجربات کو تخلیقی اظہار کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا اور پھر غزل کی مخصوص روایت اور رسومیات کا پاس ولحاظ رکھنا دردؔ کا اہم کارنامہ ہے''
(خواجہ میر درد صفحہ 125)

میر دردؔ کے یہاں ہمیں زبان و بیان کی چاشنی بھرپور ملتی ہے اور الفاظ کے انتخاب میں وہ نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ان کے یہاں ندرت بیان اور جدت طبع کی دلکشی ملتی ہے۔وہ عام سی بات کو اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ بے اختیار قاری کے زبان سے داد وتحسین کے کلمات نکلتے ہیں۔مثلاً دردؔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم سیہ کار اور گناہ گار ہیں مگر پھر بھی ہمارا درجہ اتنا بلند ہے کہ فرشتوں کو بھی ہماری بزرگی اور ہماری منزلت پر رشک ہوتا ہے۔

تردامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

7.3.3 متن

غزل I

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک! جستجو کریں؟
دل ہی نہیں رہا ہے، جو کچھ آرزو کریں

تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں، تو فرشتے وضو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں، یہ کثرت نمائیاں
گر آئینہ کے سامنے ہم آ کے ہو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال؟ جو کچھ گفتگو کریں

نے گل کو ہے ثبات، نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن! ہوس رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر
اے دردؔ! آ کے بیعت دست سبو کریں

7.3.4 غزل کی تشریح

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک! جستجو کریں؟
دل ہی نہیں رہا ہے، جو کچھ آرزو کریں

ہوس: لالچ، ضرورت سے زیادہ کی خواہش

آرزو: تمنا، خواہش

یہ شعر سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔غزل کے مطلع میں شاعر کا کہنا ہے کہ اے آسمان ہم تجھ سے کس طرح کی طلب کی امید کریں کہ جس دل میں تمنائیں پیدا ہوا کرتی ہیں وہ اب ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔یعنی ہم اپنا دل تو اپنے محبوب کے حوالے کر چکے ہیں۔اس لیے اب ہمارا جو کچھ ہونا ہے وہ محبوب کی مرضی سے ہونا ہے۔ہم میں اب اپنی کوئی خواہش کوئی تمنا باقی نہیں رہی۔شاعر نے یہاں قناعت کی تلقین کے لیے بہترین پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔اس شعر میں فلک کو مخاطب کرنے سے غرض یہ ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے سب کی آرزوئیں اور

تمنائیں پوری ہوا کرتی ہیں۔ اس شعر میں شکوہ شکایت کا بھی ایک پہلو ہے اس لئے اردو غزل کی روایت کا خیال رکھتے ہوئے شاعر نے خدا کی جگہ فلک، لفظ کا استعمال کیا ہے۔

تر دامنی پہ شیخ! ہمارے نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں، تو فرشتے وضو کریں

تر دامنی: شراب سے آلودہ دامن۔ گناہ گار ہونا

اس شعر میں خواجہ میر دردؔ بلاغت کی انتہا پر نظر آتے ہیں۔ تر دامنی کا لفظ یہاں گناہوں سے آلودہ ہونے کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ دنیا میں موجود ہر شخص فطری طور پر گناہ گار ہے، کیونکہ یہ انسان کی ایک لازمی صفت ہے۔ اسے بنیاد بنا کر یہاں شاعر شیخ کو مخاطب کرتا ہے کہ ظاہری طور پر ہمارے گناہوں پر نظر مت رکھ۔ یہ وہ مقدس لبادہ ہے کہ اگر اسے نچوڑا جائے تو اس سے برآمد ہونے والا پانی اتنا مقدس ہوگا کہ فرشتے جیسی مقدس مخلوق اس پانی سے وضو کرنا چاہے گی۔ یہاں شاعر نے انسان کے تقدس اور اس کے مرتبے کی بلندی کے انتہا کو ظاہر کیا ہے۔

مٹ جائیں ایک آن میں، یہ کثرت نمائیاں
گر آئینہ کے سامنے ہم آ کے ہو کریں

ایک دم میں : ایک لمحے میں
کثرت نمائی : بہتات کی نمائش
ہُو کرنا : اللہ ہو کی آواز نکالنا، اللہ ہُو کرنا

اس شعر میں شاعر خدا کی وحدانیت اور اس کی قدرت کاملہ کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ عام حالت میں کثرت وحدت کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہاں شاعرانہ پیرائے میں کہا گیا ہے کہ یہ آئینے میں جو مختلف شکلیں جلوہ گر ہیں اور اپنی شکل وصورت پر نازاں اور مغرور ہیں، یہ ناز وغرور ایک لمحے میں ختم ہوسکتا ہے۔ خدا کی قدرت اس درجہ طاقت ور ہے کہ ہمارا بس آئینے کے سامنے اس کا نام لے لینا ہی کافی ہوگا۔ چنانچہ اگر ہم آئینے کے سامنے جا کر 'اللہ ہو' کی ایک آواز لگائیں تو یہ ساری کثرت نمائیاں زائل ہو جائیں گی۔

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال؟ جو کچھ گفتگو کریں

سرتاقدم: سر سے پیر تک

گفتگو: بات چیت

یہاں شاعر اپنے حقیقی محبوب یعنی خداوند کریم کے سامنے اپنی ادنیٰ حیثیت کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ کہاں وہ صاحب جلال اور کہاں میں معمولی انسان۔ اس کا کہنا ہے کہ یوں تو ہم شمع کی لو (زبان) کی طرح سر سے پاؤں تک زبان ہی زبان رکھتے ہیں اور ان گنت ایسی خواہشیں ہیں جن کے بارے میں ہم کچھ کہنے کے لیے بے چین ہیں لیکن خدا کی قدرت اور اس کے جلال کے آگے اس طرح خوف زدہ کھڑے ہیں کہ ہمیں یہ حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ خواہشات کی شدت کے باوجود اس سے کچھ کہنے کی ہمت کر سکیں۔

نے گل کو ہے ثبات، نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن! ہوس رنگ و بو کریں

ثبات: دوام، ہمیشہ کی زندگی

اعتبار: بھروسا

دنیاوی چیزوں کے حصول اور ان چیزوں کو استعمال کرنے کے لیے شاعر حیات دائمی ہونے کی شرط رکھ رہا ہے۔ چنانچہ اپنی بات وہ چمن کے لوازمات کے ساتھ اس طرح کہتا ہے کہ نہ تو گل کو حیات دائمی حاصل ہے اور نہ ہی میری زندگی کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کب تک رہے گی۔ چنانچہ جب میری اور پھولوں کی زندگی ہی چند روزہ ہے تو رنگ و بو کی ہوس کرنے اور ان کو حاصل کرنے کی تگ و دو کرنے سے کیا حاصل ہے۔ ان کے لیے بھاگ دوڑ تو اس صورت میں کی جاسکتی تھی جب اس بات کا یقین ہو کہ ہماری زندگی انھیں برتنے کے لیے کافی ہوگی اور خود پھولوں کی زندگی بھی دائمی ہوگی کہ نہ ان کا رنگ خراب ہوگا اور نہ خوشبو زائل ہوگی۔ جب ان دونوں ہی چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں تو انھیں حاصل کرنا بے سود ہے۔

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر
اے دردؔ! آ کے بیعت دست سبو کریں

صلاح: مشورہ

زاہد: نیک اور پارسا لوگ

بیعت: اعلان وفاداری

سبو: شراب کا برتن

غزل کے مقطعے میں شاعر کا یہ کہنا ہے کہ شہر کے تمام نیک اور پرہیزگار لوگوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ آئیں اور آکر صراحی شراب کے ہاتھ پر بیعت کریں یعنی شراب کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کریں۔ یہاں شراب دراصل شراب معرفت ہے، جسے اردو کے شاعروں نے اپنی شاعری میں اکثر تقدس کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ کسی کے تجدید بیعت کی ضرورت دراصل اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس بات کا شبہ ہو جائے کہ اس کی وفاداری مشکوک ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس بلیغ شعر میں پوشیدہ مفہوم یہ ہے کہ شاعر کی نظر میں شہر کے تمام نیک اور عبادت گزار لوگوں کی وفاداری مشکوک ہے اور اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ وہ تجدید بیعت کر کے دوبارہ اپنی وفاداری کا اعلان کریں۔

I غزل کے محاسن:

خواجہ میر دردؔ کی یہ غزل ان کے کلام کی شیرینی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس میں ان کی فکر اور شاعرانہ انداز اظہار اپنی انتہا پر دکھائی دیتا ہے۔ غزل کے تمام شعر روحانیت میں ڈوبے ہوئے اور تصوف سے متعلق ہیں۔ یعنی ان اشعار میں شاعر کا محبوب خود خداوند کریم ہے۔ شاعر نے اس غزل میں محبوب حقیقی سے اظہار عقیدت اور شکایت زمانہ دونوں کے لیے مہذب اور شائستہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ شیخ، شراب، تردامنی جیسے الفاظ اردو شاعری میں فارسی کے راستے سے پہلے ہی داخل ہو چکے تھے اور انھیں تقدس حاصل تھا۔ شراب کے مفہوم میں عربی اور فارسی کا فرق

اس بات کا سبب بنا کہ اس سے شاعر اپنے انداز سے ذو معنویت عطا کر سکتے تھے۔ عربی میں جہاں اس لفظ سے مراد پی جانے والی کسی بھی چیز سے ہے اور اس کا مادہ 'شرب' ہے، وہیں فارسی میں یہ شر اور آب کے اشتراک سے بنا ہوا ایک لفظ ہے، جس کا مفہوم وہ پانی جس میں شرارت بھری ہو، ہوتا ہے۔

اس غزل میں اظہار کا مجازی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے جو شعریات کے لیے سب سے بہتر انداز اظہار تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں تشبیہات، استعارات اور علم بیان کی دیگر شاخوں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ زبان رواں دواں ہے جو دردؔ کی غزلوں کا خاص وصف ہے۔ دردؔ کے لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شعریات میں صوفیانہ اظہار کے لیے ایک مخصوص زبان اختراع کی جس کی تقلید بعد میں بھی کی جاتی رہی۔

غزل II

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے — جس لیے آئے تھے، سو ہم کر چلے
زندگی ہے، یا کوئی طوفان ہے؟ — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے؟ اے صبا! — ایک دم آئے ادھر، اودھر چلے
شمع کی مانند، ہم اس بزم میں — چشم تر آئے تھے، دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اُس کو پرے — شیخ صاحب، چھوڑ گھر، باہر چلے
ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دردؔ! کچھ معلوم ہے؟ یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے، کیدھر چلے

اشعار کی تشریح:

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے — جس لیے آئے تھے، سو ہم کر چلے

تہمت: الزام

چند: کچھ

اس شعر میں دنیا میں آنے کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اپنی پوری زندگی اچھے اور برے کاموں کی انجام دہی میں گزار دیتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو اس کی موت کے بعد اس کے اچھے اور برے کارنامے ہی یاد کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس پر تہمت لگاتے ہیں اور بہتان تراشی کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہم جس لیے آئے تھے وہ کر چکے اور اپنے ذمے تہمت کا داغ لے کر جا رہے ہیں۔ یعنی اب ہم اس دنیا سے رخصت تو ہو رہے ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ جا رہے ہیں اور اس افسوس کے ساتھ بھی جا رہے ہیں کہ کاش تھوڑی عمر اور مل جاتی تو اچھے کام کر لیتے مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے مرنے والا دنیا سے رخصت ہوتے وقت اسی افسوس کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے۔ شاعر کا اشارہ اسی جانب ہے اور وہ یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ وہ گناہوں کا بوجھ اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

زندگی ہے، یا کوئی طوفان ہے؟ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس شعر میں زندگی کو طوفان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی طوفان میں جس طرح کی بلا خیزی اتار چڑھاؤ، نشیب وفراز ہوتے ہیں، ٹھیک زندگی بھی اسی طوفان کے مانند ہے۔ ہم نے زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ، مصائب، دکھ درد اور آفتیں برداشت کی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ زندگی نہیں ہے بلکہ مصیبتوں کا طوفان ہے اور اس طوفان سے ہم اس قدر نبرد آزما ہوتے رہے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم زندہ نہیں ہیں، بلکہ مر چکے ہیں۔ یعنی ہم نے زندگی میں اتنی مصیبتیں برداشت کی ہیں کہ اس زندگی میں ہمیں موت نظر آنے لگی ہے۔ صنعت تشبیہ کی خوبصورت مثال اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔

کیا ہمیں کام ان گلوں سے؟ اے صبا! ایک دم آئے ادھر، اودھر چلے

صبا: ہوا (صبح کی ہو)

اودھر: اُدھر

اس شعر میں شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے زندگی میں بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں اور زندگی کی حقیقت سے آشنائی حاصل کر چکے ہیں۔ ہم کو ان گلوں کی بھی حقیقت معلوم ہے کہ یہ پھول صرف چند لمحوں کے لئے کھلتے ہیں پھر مرجھا جاتے ہیں۔ اس لیے اے بادِ صبا! ہمیں ان گلوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے شگفتہ ہوئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ان میں پژمردگی آ گئی۔ اس لیے ہم ان پھولوں کے وقتی حسن پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ یہ صرف انسان کو اپنے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے کھلتے ہیں اور ہم وقتی حسن پرستی کے قائل نہیں۔ ہم تو اس حسن کے قائل ہیں جس کا حسن دائمی ہے۔ یعنی خدائے واحد کی جانب اشارہ ہے۔

شمع کی مانند، ہم اس بزم میں چشم تر آئے تھے، دامن تر چلے

مانند : طرح

بزم : محفل، انجمن

چشمِ تر : بھیگی آنکھیں

دامن تر : بھیگا ہو دامن (گناہ آلودہ)

یہ شعر انسان کی اس کیفیت کو بیان کرتا ہے، جس سے وہ اپنے وجود کی ابتداء میں دوچار ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں شاعر کا تصور ہے کہ انسان اس دنیا میں شمع کی طرح صاف روشن اور امید کا سہارا لے کر آیا تھا۔ لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے ساتھ گناہوں کی آلودگی ساتھ ساتھ گئی۔ یعنی وہ جب اس دنیا میں آیا تھا تو نہایت پاک وصاف اور معصوم تھا، لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے ساتھ گناہوں کے انبار تھے۔ یہاں چشم تر سے مراد پاک صاف اور نورانی ہے اور دامن تر سے مراد گناہوں کا بوجھ ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اس زندگی کی سچائی بیان کی ہے جو ناقابل انحراف ہے اور جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا ہے۔

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اُس کو پرے شیخ صاحب، چھوڑ گھر، باہر چلے

آپ سے: خود سے

پرے: باہر، دور

اس شعر میں شاعر اپنے قاری کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اگر وہ خدا کا متلاشی ہے تو وہ اسے خود اپنے وجود کے اندر تلاش کرنے کی کوشش کرے لیکن انسان اسے باہر تلاش کرتا رہتا ہے اور ساری عمر گزر جانے کے باوجود اسے نہیں پاتا۔ یہاں شیخ کو مرکز میں رکھ کر شاعر نے یہی بات شاعرانہ انداز میں اس طرح کہی ہے کہ شیخ صاحب خدا کی

تلاش تو کرنا چاہتے ہیں لیکن غلطی یہ کر رہے ہیں کہ وہ اُسے اپنے وجود میں تلاش کرنے کے بجائے باہر ڈھونڈ رہے ہیں۔ یعنی دردؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شیخ صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور وہ انسان کے وجود میں بھی موجود ہے، لہٰذا اسے اِدھر اُدھر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ساقی: شراب پلانے والا

چل چلاؤ: رخصتی کا وقت

اس شعر میں عمر کی اس منزل کا بیان ہے، جب انسان اپنی موت کی گھڑیاں گنتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو زندگی کا وقت بچا ہے اسے خوشی خوشی گزار دے۔ اس لیے دردؔ کا یہ کہنا ہے کہ اے ساقی! اب تم صرف ساغر پیش کرتے رہو اور میں شراب سے مستی حاصل کرتا رہوں۔ کیونکہ اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میرے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے اور میری زندگی کے صرف چند ایام ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس قلیل مدت میں شراب کا سہارا لوں اور زندگی کے آخری لمحوں کو خوشی و مسرت میں گزار دوں۔ شراب کے نشے میں مجھے وہ خوشی اور مستی حاصل ہوگی کہ میں پوری دنیا کو بھول جاؤں گا۔ اس لیے اے ساقی! تو اب شراب کا جام پلاتا جا۔ اور میں اس سے مستفید ہوتا رہوں۔ اس شعر میں زندگی کی وہ تلخ حقیقت پوشیدہ ہے جو حقیقی اور حتمی ہے۔

دردؔ! کچھ معلوم ہے؟ یہ لوگ سب　　　کس طرف سے آئے تھے، کیدھر چلے

کیدھر: کدھر

دنیا میں آج تک اس معمے کو کوئی بھی حل نہ کر سکا کہ وہ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے۔ بڑے بڑے شعراء نے اس فلسفے کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ فارسی کے مشہور رباعی گو شاعر عمر خیامؔ نیشاپوری نے بھی اس فلسفے کو اپنی رباعی میں پیش کیا ہے کہ دنیا میں جہاں سے ہم آتے اور چلے جاتے ہیں نہ اس کی ہمیں ابتدا معلوم ہے نہ انتہا کی خبر ہے۔ کوئی بھی شخص اچھی طرح یہ بات نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں چلا جائے گا۔ اسی فلسفے کو دردؔ نے بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے دردؔ! کیا تمہیں کچھ اس بات کی خبر ہے کہ اس دنیا میں جتنے لوگ آتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور پھر پوری زندگی گزار کر کہاں چلے جاتے ہیں؟ دردؔ نے سوالیہ انداز میں شعر لکھا ہے اور خود سے مخاطب ہو کر دنیا کی ناپائیداری اور انسان کی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ دردؔ نے سوالیہ انداز میں یہ شعر لکھ کر شعری حسن میں اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی شعر کی خوبی تصور کی جاتی ہے۔

II غزل کے محاسن

اس غزل میں دردؔ نے صوفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ دنیا کی ناپائیداری اور اس کی اصل حیثیت کی تصویر کشی کی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور دنیا میں رہ کر گناہوں سے آلودہ انسان، اس غزل کے اشعار کے بیشتر موضوعات ہیں۔ دردؔ کا خیال ہے کہ اس عالم بے ثبات میں رنگینیوں اور دلچسپیوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن یہ سب یادِ خداوندی سے غفلت کا سبب بنیں تو ایسی آسائشوں سے گریز کرنا چاہیے۔ انھوں نے اس دنیا میں رہ کر آخرت کی تیاری پر زیادہ زور دیا ہے۔ ظاہر ہے تصوف میں عشق الٰہی کے جو لوازم ہیں، دردؔ نے انھیں بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ برتا ہے۔ نام نہاد علمائے دین، جن کے لیے انھوں نے شیخ کی علامت کا استعمال کیا ہے، جو لوگوں کو راہ راست پر لانے کے بجائے راہ راست سے ہٹانے کا کام زیادہ کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ مذہب کی روح ہی سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ دردؔ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ اس چار روزہ زندگی میں جتنا ممکن ہو سکے دنیاوی عیش و آرام سے گریز کرتے ہوئے اپنا بیشتر وقت یادِ خداوندی میں صرف کرنا چاہیے۔

دردؔ نے اس غزل میں زبان کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ ان کے مزاج کے عین مطابق تشبیہات کا نظام بھی یہاں لائق توجہ ہے جو اس غزل کا مرتبہ و معیار بلند کرتا ہے۔ حالانکہ اس عہد تک آتے آتے زبان میں ویسے بھی بڑی حد تک صفائی آ چکی تھی لیکن کچھ شعرا کے یہاں فارسی کا غلبہ تھا۔ دردؔ کی زبان قدیم ہونے کے باوجود غیر مانوس نہیں۔ اس غزل کا ہر شعر سلیس، شستہ اور عام فہم الفاظ و علامات سے مزین ہے۔ جس سے اس کے اثر کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

7.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- غزلوں کے مطالعے سے ان کی صحیح قرأت اور ان میں شامل لفظیات و تراکیب نیز مفہوم کو سمجھا۔
- میر دردؔ کے اسلوب کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کی۔
- غزلوں کے موضوعات پر نظر ڈالی۔
- میر دردؔ کے حالاتِ زندگی سے جانکاری حاصل کی۔
- میر دردؔ کے ہم عصروں سے واقف ہوئے۔

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ میر دردؔ کے ہم عصروں کے نام بتائیے۔

2۔ میر دردؔ کس عہد سے تعلق رکھتے ہیں؟

3۔ پہلی غزل کے دوسرے شعر میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟

تر دامنی پہ شیخ! ہمارے نہ جائیو　　　دامن نچوڑ دیں، تو فرشتے وضو کریں

4۔ دوسری غزل کے پہلے شعر کی تشریح کیجیے؟

تہمت چندا اپنے ذمے دھر چلے　　　جس لیے ہم آئے تھے، سو کر چلے

7.6 سوالات کے جوابات

1۔ میر دردؔ کے ہم عصروں میں سوداؔ، میر تقی میرؔ، میر اثرؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی وغیرہ آتے ہیں۔

2۔ میر دردؔ کا عہد اردو غزل کا کلاسیکی عہد ہے، جو 18 ویں صدی کے دہلی کے شعراء سے شروع ہو کر لکھنؤ پر ختم ہوتا ہے۔

3۔ تر دامنی پہ شیخ! ہمارے نہ جائیو　　　دامن نچوڑ دیں، تو فرشتے وضو کریں

اس شعر میں خواجہ میر درد بلاغت کی انتہا پر نظر آتے ہیں۔ تر دامنی کا لفظ یہاں گناہوں سے آلودہ ہونے کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ دنیا میں موجود ہر شخص فطری طور پر گناہ گار ہے، کیونکہ یہ انسان کی ایک لازمی صفت ہے۔ اسے بنیاد بنا کر یہاں شاعر شیخ کو مخاطب کرتا ہے کہ ظاہری طور پر ہمارے گناہوں پر نظر مت رکھ۔ یہ وہ مقدس لبادہ ہے کہ اگر اسے نچوڑا جائے تو اس سے برآمد ہونے والا پانی اتنا مقدس ہوگا کہ فرشتے جیسی مقدس مخلوق اس پانی سے وضو کرنا چاہے گی۔ یہاں شاعر نے انسان کے تقدس اور اس کے مرتبے کی بلندی کے انتہا کو ظاہر کیا ہے۔

4۔ تہمت چندا اپنے ذمے دھر چلے　　　جس لیے آئے تھے، سو ہم کر چلے

اس شعر میں دنیا میں آنے کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اپنی پوری زندگی اچھے اور برے کاموں کی انجام دہی میں گزار دیتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو اس کی موت کے بعد اس کے اچھے اور برے کارنامے ہی یاد کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس پر تہمت لگاتے ہیں اور بہتان تراشی کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہم جس لیے آئے تھے وہ کر چکے اور اپنے ذمے تہمت کا داغ لے کر جا رہے ہیں۔ یعنی اب ہم اس دنیا سے رخصت تو ہو رہے ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ جا رہے ہیں اور اس افسوس کے ساتھ بھی جا رہے ہیں کہ کاش تھوڑی عمر اور مل جاتی تو اچھے کام کر لیتے مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے مرنے والا دنیا سے رخصت ہوتے وقت اسی افسوس کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے۔ شاعر کا اشارہ اسی جانب ہے اور وہ یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ وہ گناہوں کا بوجھ اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے۔

7.7 فرہنگ

ہوس : لالچ رضرورت سے زیادہ کی خواہش

آرزو : تمنا رخواہش

تر دامنی : شراب سے آلودہ دامن۔ گناہ گار ہونا

سر تا قدم : سر سے پیر تک

گفتگو	:	بات چیت
ثبات	:	دوام، ہمیشہ کی زندگی
اعتبار	:	بھروسہ
صلاح	:	مشورہ
زاہد	:	نیک اور پارسا لوگ
بیعت	:	اعلان وفاداری
سبو	:	شراب کا برتن
تہمت	:	الزام
چند	:	کچھ
صبا	:	ہوا
اودھر	:	اُدھر
مانند	:	طرح
بزم	:	محفل، انجمن
چشم نم	:	بھیگی آنکھ
دامن تر	:	بھیگا دامن (گناہ سے آلودہ)
آپ سے	:	خود سے
پرے	:	باہر، دور
ساقیا	:	شراب پلانے والا
چل چلاؤ	:	جانے کو تیار، رخصتی کا اشارہ
کیدھر	:	کدھر

7.8 کتب برائے مطالعہ

1۔	کلیاتِ خواجہ میر دردؔ	خواجہ میر دردؔ
2۔	خواجہ میر درد	وحید اختر
3۔	تاریخِ ادبِ اردو	سیدہ جعفر
4۔	خواجہ میر درد	ظہیر احمد صدیقی
5۔	خواجہ میر درد	قاضی جمال حُسین
6۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حُسین

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 8 خواجہ حیدر علی آتش کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

8.1 اغراض و مقاصد
8.2 تمہید
8.3 خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ
8.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت
8.3.2 آتش کا فن
8.3.3 متن اور اس کی تشریح
8.4 آپ نے کیا سیکھا
8.5 اپنا امتحان خود لیجیے
8.6 سوالات کے جوابات
8.7 فرہنگ
8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- خواجہ حیدر علی آتش کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے۔
- خواجہ حیدر علی آتش کے کلام کی اردو شاعری میں قدر و قیمت متعین کریں گے۔
- خواجہ حیدر علی آتش کے ہم عصر شعرا سے واقف ہوں گے۔
- خواجہ حیدر علی آتش کے نمائندہ کلام کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے۔

8.2 تمہید

اُردو غزل کے چند مقبول اور ممتاز شعرا میں خواجہ حیدر علی آتش کا شمار ہوتا ہے۔ دبستان لکھنو کی جب بھی بات ہوتی ہے تو سب سے پہلے شیخ امام بخش ناسخ اور ان کے ہم عصر خواجہ حیدر علی آتش کا ذکر آتا ہے۔ ناقدین نے اکثر ناسخ اور آتش کی شاعری کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ آتش جس وقت لکھنو میں شاعری کر رہے تھے اس وقت دہلی میں استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم مومن خاں مومن، بہادر شاہ ظفر اور مرزا اسداللہ خاں غالب کی شاعری کی دھوم تھی۔ ادھر لکھنو میں آتش سے ذرا پہلے شیخ غلام ہمدانی مصحفی اور انشاء اللہ خاں انشا کی شاعری کے چرچے تھے۔ آتش کچھ وقت تک مصحفی کے شاگرد بھی رہے، لیکن بعد میں اپنی قابلیت اور ریاضت کی وجہ سے وہ خود استادِ فن کے مسند پر براجمان ہوئے۔ آتش کی شاعری میں بلا کی سرمستی اور روانی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک صوفی تھے اس لیے ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہے۔ بندش کی چستی کے لئے بھی آتش مشہور ہیں۔ ان کے کلام میں ایک والہانہ پن پایا جاتا ہے۔

8.3 خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

8.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

اردو شاعری کے حوالے سے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کی اصطلاحیں خوب رائج ہیں۔ دبستانِ لکھنو کی پہچان اور شان جن دو شاعروں کی بدولت بامِ عروج پر پہنچی ان کے نام شیخ امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ ہیں۔ آتشؔ کا تعلق دلّی کے ایک صوفی خاندان سے تھا۔ ان کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلّی سے فیض آباد چلے گئے تھے۔ خواجہ زادوں کے جس خاندان سے آتشؔ کا تعلق تھا اُس میں مسندِ فقر بھی قائم تھی۔ اس خاندان میں صدیوں سے پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا۔ بچپن میں ہی آتشؔ کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ وہ کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن ایک بے پروا اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کا موقع انھیں ضرور ملا۔ بچپن سے ہی ان کے مزاج میں ایک طرح کی آزادی اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ آزادانہ، رندانہ اور سپاہیانہ وضع رکھتے تھے۔ خاندان کا تمغا قائم رہے اس لئے ان کی شخصیت میں کچھ رنگ فقیری کا بھی نمایا تھا۔ کم عمری میں ہی فیض آباد سے لکھنو چلے گئے تھے جو اُس زمانے میں شعر و شاعری کا مرکز تھا۔ ہر طرف انشاؔء اور مصحفیؔ کا بول بالا تھا۔ آتشؔ بھی مصحفیؔ کے شاگرد ہو گئے۔ لیکن استادی شاگردی کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں نہیں چلا۔ اپنی ریاضت اور مشق سے آتشؔ نے وہ مقام حاصل کیا کہ بہت جلد استاد شاعروں میں ان کا نام لیا جانے لگا۔

آتشؔ نے غزلوں کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ قصیدہ یا ہجو سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ انکی غزلوں کے دو دیوان شائع ہوئے۔ پہلا دیوان خود انھوں نے ترتیب دیا تھا۔ دوسرا دیوان ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد رشید خلیل نے ترتیب دیکر شائع کیا۔ اس عہد کے دیگر شعراء کی طرح آتشؔ بھی ناسخؔ سے متاثر تھے۔ لیکن ان کی غزلوں پر ناسخؔ کا اثر کم ہے۔ ناقدین نے آتشؔ کی غزل کو مصحفیؔ و میرؔ کی غزل کی توسیع قرار دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں اخلاقی مضامین بھی ہیں، زندگی کے حقائق پر تبصرے بھی ہیں اور تصوف کی بھرپور چاشنی بھی ہے۔ آتشؔ کی شاعری وہ گُل و بلبل والی شاعری نہیں ہے جس کے لئے لکھنو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ آتشؔ کے کلام میں عشقیہ شاعری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

یا

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چکی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

آتشؔ کے کلام میں ایک سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایک روانی ہے جو اپنے ساتھ بہائے لئے جاتی ہے۔

مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

آتش کے کلام میں جو فلسفہ ہے وہ حیاتِ انسانی کا فلسفہ ہے۔زندگی اور موت کے فلسفے کو آتش ایک بے بس انسان کی شکل میں نہیں دیکھتے ہیں۔ایک وارفتگی ہے جو موت کو بھی محبوبیت عطا کرتی ہے۔

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

8.3.2 آتش کا فن

جہاں تک فن کاری کا تعلق ہے تو آتش کی مرصع سازی زمانے بھر میں مشہور ہے۔حالانکہ ناسخ کے اثر سے یا ناسخ کی برابری کرنے کے لئے آتش نے سنگلاخ زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔لیکن اپنی خداداد تخلیقی قوتوں کی مدد سے سنگلاخ زمینوں کو بھی پانی کر کے رکھ دیا ہے۔وہ یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ:

آتش زمینِ شعر ہو ہر چند سنگلاخ
لغزش سے آشنا نہیں اہلِ سخن کے پاؤں

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فنِ شعر میں تشبیہ و استعارہ سے شعر کے حُسن میں اضافہ ہوتا ہے۔لیکن جب یہی شاعری کا اصل مقصد قرار پائے تو اشعار تاثیر سے دور جا پڑتے ہیں۔آتش نے یہ ضرور کہا ہے کہ:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

لیکن آتش کی شاعری صرف مرصع سازی نہیں ہے۔اس میں فکر کی بلندی ہے، جذبات کی گرماہٹ ہے۔عشق کی کارفرمائی ہے، تصوف کے مراحل ہیں۔آتش نے نشاطِ غم سے اپنی شعری کائنات کو سجایا ہے۔جس شدید داخلیت اور غم انگیزی کو صرف میر تقی میرؔ جیسا شاعر ہی برت سکا ہو اسے کسی حد تک آتش نے بھی نبھایا ہے۔تجرباتِ زندگی کی رنگارنگی اور موضوعات کے تنوع میں وہ غالبؔ کے ہم مرتبہ نہ سہی لیکن میرؔ و غالبؔ کے بعد خالص غزلیہ شاعری کے حوالے سے سب سے اہم نام خواجہ حیدر علی آتش کا ہے۔اور جہاں تک فلسفہ تصوف کو شاعری میں پیش کرنے کا سوال ہے تو خواجہ میر دردؔ اور خواجہ حیدر علی آتش کا نام سرِ فہرست ہے۔ان کے علاوہ حضرت آسیؔ غازی پوری اور اصغر گونڈوی کا صوفیانہ کلام بھی اردو شاعری کا عظیم سرمایہ ہے۔دراصل تصوف کو عام طور پر وہی شعراء برت سکے ہیں جو خود بھی صوفی تھے۔تصوف کے اسرار و رموز سے پوری آگاہی کے بغیر روحانی کیفیت کو بیان کرنے والی شاعری ممکن نہیں ہے۔اور تصوف کے اسرار و رموز سے آگاہی مسلسل ریاضت اور نفس کُشی سے حاصل ہوتی ہے۔پھر انسان کے باطن میں طہارت، پاکیزگی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔خواجہ حیدر علی بھی ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہی ''آتش'' بن سکے۔پھر بے خودی اور سرشاری نے ان کی شاعری کو ایک شانِ قلندری عطا کردی۔ورنہ آتش جس دور میں شاعری کررہے تھے وہاں درباری ماحول اِس قدر حاوی تھا کہ تمام شعراء نوابین اور امراء کی مدح خوانی میں مصروف تھے۔شعراء کا کام نوابین کی ہوسناکیوں کو ہوا دینا رہ گیا تھا۔ایسے میں تصوف

نے بہت حد تک اردو غزل کی آبرو رکھی۔

ہندوستان میں تصوف کے دو سلسلے ابتدا سے ہی رائج تھے۔ ایک سلسلے نے بے خودی کے اس عالم میں پہنچا دیا جہاں انسان قوتِ عمل سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسرا سلسلہ مولانا رومؔی کا تھا، جس کی پیروی بعد میں علامہ اقبال نے کی۔ مولانا رومؔی کا نظریہ حیات حرکی ہے۔ اس میں دنیا سے فرار نہیں بلکہ دنیا سے نبرد آزمائی کی تعلیم ہے۔ اقبالؔ کا مردِ قلندر فنا کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ خودی کی بات کرتا ہے۔ لیکن آتشؔ کے کلام میں جو کیفیت ہے وہ اس سے مختلف ہے۔

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

یا

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریئے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کے

ہمارے کچھ ناقدین نے آتشؔ کی صوفیانہ شاعری کو فارسی کی صوفیانہ شاعری کے مقابلے میں رکھ کر جانچنے پرکھنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً آتشؔ کی صوفیانہ شاعری کو وہ مقام نہ مل سکا جو اس کا حق تھا۔ لیکن جب ہم لکھنو کے تاریخی پس منظر میں آتشؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی صوفیانہ شاعری کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایسے حالات میں جب فحش خیالات کثرت سے شاعری میں بیان کئے جانے لگے۔ اردو غزل سے تصوف و اخلاق کو یکسر خارج کر کے اسے معاملہ بندی کی نذر کر دیا گیا۔ تب آتشؔ کی یہ آواز ہمیں چونکاتی ہے:

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

یا

دو نعمتیں یہ میری ہیں، میں ہوں فقیر مست

لکھنو میں آتشؔ کے آس پاس جو ماحول تھا وہ چاپلوسی کا تھا۔ درباروں میں جا کر خوشامد اور چاپلوسی کرنا شعراء کا دستور بن چکا تھا۔ ایسے ماحول میں آتشؔ اپنی شاعری میں بار بار درویش کی حیثیت سے آتے ہیں۔ بادشاہوں کی شان و شوکت کو چیلینج کرتے ہیں۔ انھیں یہ بتاتے ہیں کہ فقیری ہر لحاظ سے بادشاہت سے اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ وہ اپنی فقیری پہ اور اپنی بے سروسامانی پہ نازاں ہیں۔ بادشاہوں کے جاہ و جلال کو بے وقعت سمجھتے ہیں۔

مسندِ شاہی کی حسرت ہم فقیروں کو نہیں
فرش ہے گھر میں ہمارے چادرِ مہتاب کا

تصوف نے آتشؔ کو قلندری کے وہ آداب سکھائے تھے کہ ان کی وسعتوں میں انسانی اقدار کو پناہ ملی۔ ان کے یہاں مذہب اور مذہبیت کا محدود تصور نہیں ملتا۔ مذہبی منافرت پھیلانے والوں کو آتشؔ انسانیت کا دشمن سمجھتے ہیں۔

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انسان ہوئے

یا

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی ملت نہیں ہے کوئی

دراصل آتش نے فقیری اور درویشی اس لئے نہیں اختیار کی تھی کہ وہ دنیا سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس میں انکی فطری آزادروی اور سرکشی کو دخل ہے۔ ان کی فقیری، درویشی اور تصوف دراصل نظام کے خلاف ایک نعرہ انقلاب ہے۔ انھوں نے اپنی مرضی سے بوریہ نشینی اختیار کی جہاں شاہوں کے در پہ سر جھکانے سے نجات ملتی ہے۔

تصوف کے مراحل میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بھی اہم عنصر ہے۔ صوفیانہ مزاج کے حامل تمام شعراء کے یہاں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ آتش بھی کہتے ہیں۔

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

آتش کا پیغام بہت واضح ہے۔ دنیا میں جن کے پاس دولت ہے، سامانِ عیش وعشرت ہے، وہ دنیا پہ غرور نہ کریں۔ کیونکہ یہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔ جن کے پاس سامانِ عیش نہیں انھیں بھی پریشان اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ چونکہ زندگی عارضی ہے اور موت برحق ہے، اس لئے موت کا خیال ان پہ افسردگی طاری نہیں کرتا۔ راہِ تصوف میں موت اگلی منزل ہے۔ آتش بھی اس منزل کے استقبال کو تیار نظر آتے ہیں۔

شعر ڈھلتے ہیں مری فکر سے آج اے آتش
مر کے کل گور کے سانچے میں ڈھل جاؤں گا

آتش کی شاعری میں تصوف کی مقبولِ عام روایات کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی کے تمام مدارج شامل ہیں۔ عرفانِ نفس، مقامِ حیرت، وحدت الوجود، مقامِ فنا اور رضا و توکل جیسے فلسفیانہ تصورات وعقائد بھی آتش کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں۔ اسی لئے کلامِ آتش کو پڑھتے ہوئے ایک مدھم آواز ابھرتی ہے جو صوفیوں کے نعرہ مستانہ میں جذب ہو جاتی ہے۔

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

8.3.3 متن اور اس کی تشریح

غزل I

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا، شرحِ آرزو کرتے

مِری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

لُٹاتے دولتِ دنیا کو میکدے میں ہم
طلائی ساغر مے نقرئی سبو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

یہ کعبے سے نہیں بے وجہ نسبتِ رُخِ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے

سکھاتے نالۂ شبگیر کو دراندازی
غمِ فراق کا اس چرخ کو عدو کرتے

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتشؔ!
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

تشریح:

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بے تاب گفتگو کرتے

چمن میں گل اور بلبل ایک عاشق اور معشوق کی طرح رہتے ہیں۔ روایت یہی ہے کہ گل اور بلبل ایک دوسرے پر فریفتہ ہیں۔ گل کو عاشق اور بلبل کو محبوبہ کی طرح جانا گیا ہے۔ اسی روایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے محبوب کو گل کے روبرو کر دے اور خود بلبل بے تاب سے گفتگو کرے۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب گل کی طرح خوبصورت ہے۔ جب محبوب اور گل روبرو یعنی ایک دوسرے کے سامنے ہونگے تو یہ دیکھنا بھی دلچسپ ہوگا کہ کون زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف گل کے روبرو محبوب کو دیکھ کر بلبل کو ایک تڑپ ہوگی۔ ایسے میں عاشق اور بلبل دونوں کی گفتگو کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا، شرحِ آرزو کرتے

عشق کے مرحلے میں عاشق اور معشوق کے درمیان ایک قاصد، پیامبر یا نامہ بر بھی ہوتا ہے۔ جو ایک دوسرے کا پیغام پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ عام طور پر تو عاشق اس پیامبر کی بڑی بے صبری سے انتظار کرتا ہے۔ لیکن یہاں شاعر نے ایک انوکھے پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پیامبر کا میسر نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ جو کچھ محبوب سے کہنا تھا وہ روبرو کہتے تو کہنے کا لطف تھا۔ زبان غیر سے بھلا کیا شرح آرزو کرتے۔ یعنی اپنے دل کی بات بھلا کسی پیامبر کی زبانی کیوں کر ادا کر پاتے۔ اس لئے پیامبر میسر نہیں آیا تو اچھا ہی ہوا۔

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

شاعر چاند اور سورج کے بھٹکنے کو ان کی آوارگی سے تعبیر کرتا ہے۔ چونکہ شاعر بھی عشق میں مبتلا ہے اور اس عشق کے سبب آوارگی کر رہا ہے۔ ایسے میں جب اسے مہ و مہر یعنی چاند سورج کی گردش کا پتہ چلتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے یہ چاند سورج بھی کسی حبیب یعنی محبوب کی آرزو میں ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔ آسمان میں چاند اور سورج اپنی جگہ جو بدلتے رہتے ہیں کبھی اس سمت تو کبھی اس سمت نظر آتے ہیں گویا یہ بھی ہماری طرح کسی محبوب کی تلاش میں ہیں۔

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

شاعر کہتا ہے کہ زمانہ ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔ بلکہ زمانہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ صبح ہوتی ہے تو شام بھی ہوتی ہے۔ صبح کا اُجالا اگر ہمیں نظر آتا ہے تو رات کی تاریکی بھی دیکھتے ہیں۔ اسی مناسبت سے انسان بھی رنگ بدلتا ہے۔ یعنی شاعر اگر سفید رنگ ہے تو اپنے بالوں کو سیاہ یعنی کالا کرتا ہے۔ یہاں شاعر نے سفید اور سیاہ ایک

مصرعے میں لا کر صنعت تضاد کا استعمال کیا ہے۔

لُٹاتے دولتِ دنیا کو میکدے میں ہم
طلائی ساغر مے نقرئی سبو کرتے

شاعر دنیا کی دولت کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ جو دنیا کی دولت ہے اسے تو ہم شراب خانے میں لٹا دیتے۔ وہ اس طرح کی شراب کا پیالہ سونے کا ہوتا اور شراب رکھنے کا جو مٹکا ہوتا ہے وہ چاندی کا ہوتا۔اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دولت دنیا اسی لائق ہے کہ اسے کسی میکدے یعنی شراب خانے میں لٹا دیا جائے۔ میکدے کے جو لوازمات ہیں یعنی شراب رکھنے کا گھڑا اور جام یعنی پیالہ وہ چاندی اور سونے کا ہو۔

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

شاعر اپنے دیوانہ پن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے خود ہمیشہ اپنا گریبان چاک کیا ہے۔ اپنا گریبان خود پھاڑتے رہے ہیں۔ جو رفو گر تھے یعنی رفو کرنے والے وہ زندگی بھر رفو کرتے رہے۔ اس شعر میں شاعر نے بڑی خوبصورتی سے دل اور دماغ کی جنگ کو بھی بیان کر دیا ہے۔ دراصل شاعر دل کی سنتا ہے، جبکہ عقل مند آدمی دل کے بجائے دماغ کی سنتا ہے۔ دماغ ہمیشہ فائدہ کی بات بتاتا ہے جبکہ دل گھاٹے کا سودا کر لیتا ہے۔ عقل والے یعنی دماغ والے تو رفو کرتے ہیں جبکہ جو دل والے ہیں، جنوں والے ہیں وہ خود اپنا ہی گریباں چاک کرتے رہتے ہیں۔

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

محبوب کی زلف کو اکثر زنجیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یوں بھی بالوں کی بناوٹ کچھ زنجیر جیسی ہوتی ہے۔ لیکن محبوب کی زلفیں اتنی دلکش ہیں کہ اگر کوئی انھیں دیکھ لے تو وہ ان زلفوں کا قیدی بن جانے کی جستجو کرے گا۔ حالانکہ انسان قید یعنی اسیری سے آزادی چاہتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔ محبوب کی زنجیر نما زلفوں میں وہ دلکشی ہے کہ جو آزاد ہیں وہ بھی قید ہونے کی آرزو کرتے۔ محبوب کی زلفوں کو بادل سے اور کالی گھٹاؤں سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ زلفیں جب لہرائیں تو گھٹا چھا جاتی ہے۔ اسی کو شاعر نے زنجیر زلف کا عالم کہا ہے۔ اور جب کوئی عاشق اس عالم میں ان زلفوں کو دیکھ لے تو وہ چاہے گا کہ انھیں زلفوں کا قیدی بن کے رہے۔

یہ کعبے سے نہیں بے وجہ نسبتِ رُخ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے

یار یعنی محبوب کے رخ کو کعبہ سے جو نسبت ہے وہ بے سبب نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا رخ یعنی چہرہ اس قدر پاکیزہ ہے کہ عبادت کرنے کو جی چاہے۔ اس بات پہ غور کریں تو شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے کہ کعبہ خوبصورت بھی ہے اور پاکیزہ بھی۔ ٹھیک اسی طرح محبوب کا چہرہ خوبصورت بھی ہے اور پاکیزہ بھی۔ اب ایک اور

بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اس کے چہرے کو کعبہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ اب شاعر یہاں سے ایک پہلو نکالتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے فراق میں تڑپ تڑپ کے مرجاتا ہے تو مرنے کے بعد اس کو قبلہ رو کر دیتے ہیں۔ یعنی کعبہ اور محبوب کے چہرے میں جو مشابہت ہے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

سکھاتے نالۂ شبگیر کو درانداز ی
غمِ فراق کا اس چرخ کو عدو کرتے

شبگیر یعنی رات کے پچھلے پہر جو فریاد کی جائے اسے درانداز ی سکھاتے ہیں۔ چرخ کے معنی ہوتے ہیں آسمان اور عدو کے معنی دشمن کے۔ اب شعر پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ شاعر یعنی عاشق اپنے محبوب کی یاد میں رات کو جاگ رہا ہے۔ رات کا پچھلا پہر ہے اور عاشق اب بھی جاگ رہا ہے اور فریاد کر رہا ہے۔ آہیں بھر رہا ہے۔ اب وہ جس فراق کے غم میں مبتلا ہے اس غم میں آسماں کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ یعنی اب آسماں کو بھی اپنا دشمن بنا لیتا ہے۔

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

بہت آسان اور خوبصورت شعر ہے۔ شاعر اپنے محبوب کو جان جاں کہتا ہے۔ اب محبوب کے نہ آنے سے وہ اپنا دل جگر سب لہو کر رہا تھا۔ محبوب اگر نہیں آتا تو پھر موت ہی آتی کیونکہ اس کی یاد میں کب تک کوئی دل اور جگر کو لہو کرتا۔ سیدھا سا مطلب ہے کہ محبوب اگر اپنے عاشق کے پاس نہ آئے تو پھر عاشق کی موت یقینی ہے۔ وہ محبوب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ محبوب پاس نہ ہو تو وہ اس کی یاد میں اپنا دل لہو کرتا رہتا ہے۔ اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ بہت دیر تک دل لہو کریں تو موت آجائے گی۔

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتِش!
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

یہ اس غزل کا مقطع ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنا تخلص ''آتش'' استعمال کیا ہے۔ برگشتہ کے معنی ہوتے ہیں پھرا ہوا یا منحرف۔ اور طالع قسمت یا نصیب کو کہتے ہیں۔ شاعر اپنی خراب قسمت کا رونا رو رہا ہے۔ یعنی اس کی قسمت اس قدر خراب ہے کہ مت پوچھو۔ وہ اگر بارش کی آرزو کرتا تو آسمان سے آگ برسنے لگتی۔ اس موضوع کو کئی شاعروں نے الگ الگ ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ یعنی جب انسان کی قسمت خراب ہو تو بنتا ہوا کام بھی بگڑ جاتا ہے۔ بارش کی دعا کریں تو آگ برسنے لگتی ہے۔ کچھ اچھے کی دعا کریں تو کچھ برا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب برگشتہ طالعی یعنی قسمت کے خراب ہونے کے سبب ہوتا ہے۔

غزل II

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے
زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گُل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے
تپ ہجر کی کاہشوں نے کیے ہیں
جُدا پوست سے استخواں کیسے کیسے
نہ مُڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے
غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

تشریح:

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

شاعر اپنے محبوب سے شکایت کرتا ہے کہ اس کے مُنہ پہ کیسے کیسے گماں یعنی خیال یا وہم اور شک ہیں۔ اسی لیے جب محبوب اپنے عاشق سے بات کرتا ہے یعنی کلام کرتا ہے تو اس کے درمیاں کیسی کیسی باتیں آتی ہیں۔ اگر محبوب کے چہرے پر یہ شک اور وہم نہ ظاہر ہوتے تو عاشق یہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ آخر ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہو رہی ہے اس میں یہ عجیب عجیب جملے اور عجیب عجیب باتیں کہاں سے آ رہی ہیں۔

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

خواجہ حیدر علی آتش کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور تغیر زمانہ کا شکوہ ہے اس شعر میں۔ یعنی شاعر بتا رہا ہے کہ اس دنیا میں ہمیں جو کچھ نظر آرہا ہے سب بدل جانے والا ہے۔ کچھ بھی پائدار نہیں ہے۔ گل کھلانا محاورہ ہے۔ یعنی یہ جو زمین ہے یہ ایک چمن کی مانند ہے لیکن یہ کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ آسمان کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گُل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

شاعر اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں تنہا ہی تمہاری یاد میں شہید ہونے والا نہیں ہوں۔ بلکہ کیسے کیسے گل و لالہ وارغواں بھی تمہارے شہیدوں میں داخل ہیں۔ ارغواں بھی ایک لال رنگ کا پھول ہوتا ہے۔ گل اور لالہ بھی پھول ہیں۔ پھول میں تازگی، خوشبو اور نزاکت ہوتی ہے۔ پھول معصوم ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں عاشق اپنے آپ کو پھولوں کے ساتھ رکھ کر بات کرتا ہے۔ یعنی اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ ایک میں ہی معصوم تمہاری یاد میں شہید نہیں ہوا ہوں بلکہ اور بھی کئی میری طرح تمہارے لئے شہید ہو چکے ہیں۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب بے وفا ہے، اس کی یاد میں صرف ایک نہیں بلکہ کئی لوگوں نے جان گنوائی ہے۔

بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

اُردو شاعری میں خزاں اور بہار کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ بہار آتی ہے تو چہرے کھل جاتے ہیں، ہر جانب مستی کا عالم ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک موسم بہار کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ بہار آئی ہے تو پیر مغاں کے مرید کیسے کیسے جھوم رہے ہیں۔ چونکہ کسی معمولی شاعر کا نہیں بلکہ آتش کا شعر ہے اس لئے بظاہر اس معمولی شعر میں بھی کئی پہلو نکلتے ہیں۔ لفظ پیر مغاں کے دو معنی ہیں۔ شراب بیچنے والے کو پیر مغاں کہتے ہیں۔ یعنی بہار کا موسم ہے اور شراب بیچنے والے کے مرید کیسے کیسے جھوم رہے ہیں یعنی اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ دوسرا پہلو ہے کہ کیسے کیسے مرید جھوم رہے ہیں۔ لفظ پیر مغاں کا ایک مطلب آتش پرستوں کا پیشوا بھی ہوتا ہے۔ بہار کے موسم میں آتش پرستوں کے پیشوا اور ان کے کیسے کیسے مریدین جھوم رہے ہیں۔

تپ ہجر کی کاہشوں نے کیے ہیں
جُدا پوست سے استخواں کیسے کیسے

شاعر کہتا ہے کہ ہجر یعنی محبوب سے جدائی کا جو تپ یعنی جو حرارت اور گرمی ہوتی ہے اس میں جو کمی آئی ہے اس نے کیسے کیسے جسم سے کھال اور ہڈیوں کو جدا جدا کر دیا ہے۔ کاہش کے معنی ہوتے ہیں کمی کے اور پوست کے معنی ہوتے ہیں کھال یا چمڑے کے۔ اور استخواں کے معنی ہوتے ہیں ہڈیوں کے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہجر میں جو گرمی اور حرارت ہوتی ہے اس میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ جسم سے کھال اور ہڈیاں کیسے کیسے جدا ہو جاتی ہیں۔

نہ مُڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

اُردو شاعری میں معشوق کو بے درد، بے رحم اور سنگ دل کہا گیا ہے۔ معشوق کے عشق میں گرفتار عاشق اپنی جان دے دیتے ہیں لیکن بے درد معشوق پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھتا۔ اسی بات کو شاعر نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ نیم جاں یعنی ادھ مرا عاشق کیسے کیسے تڑپتا رہا لیکن بے درد قاتل یعنی معشوق نے ایک بار بھی مُڑ کر نہیں دیکھا۔

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

یہ خواجہ حیدر علی آتش کا بہت مشہور شعر ہے۔اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔سکندر اور دارا نام کی دو تاریخی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا سے کیسے کیسے نامی گرامی ، کیسے کیسے مشہور لوگوں کا نام ونشاں تک مٹ گیا۔مثال کے طور پر سکندر اور دارا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ سکندر کہاں دفن ہے؟ اس کا گور کہاں ہے کسی کو نہیں معلوم جبکہ سکندر فاتح عالم تھا۔اسی طرح دارا کی قبر کا بھی کچھ اتا پتا نہیں ہے۔

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

بہت سادہ سا شعر ہے۔شاعر کہتا ہے کہ باغ میں بہار کی آمد آمد ہے۔اور اس خوشی میں باغباں خوشیاں منا رہے ہیں۔خوشی پھرنا مطلب خوشی منانا۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ دنیا ایک گلستاں کی طرح ہے۔اور اس میں رہنے والے باغباں ہیں۔گویا جب گلستاں میں بہار آئے گی تو باغباں خوش ہونگے۔

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے

شاعری میں محبوب کو اگر ظالم اور بے درد کہا گیا ہے تو اسی محبوب کو مسیحا یعنی زندہ کرنے والا بھی کہا گیا ہے۔یعنی محبوب اگر محبت اور التفات کی نظر سے دیکھ لے تو مردہ عاشق بھی جی اُٹھتا ہے۔شاعر اپنے مسیحا یعنی اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میرے مسیحا تیری توجہ نے کیسے کیسے ناتواں یعنی کمزور کو توانا یعنی اچھا تندرست کر دیا۔

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

شاعر کہتا ہے کہ کوئی اچھی چیز تو اس کے قسمت میں آئی ہی نہیں ہے۔محبوب سے اسے جو کچھ ملا ہے وہ ہے غم، غصہ، رنج ، تکلیف، بدنصیبی اور مایوسی۔یعنی یہی سب ہمارے مہرباں ہیں۔عشق میں اکثر یہی سب سوغات ملتی ہے۔محبوب کی بے وفائی نے یہی سب تحفہ دیا ہے۔اس میں ایک طنز کا پہلو ہے کہ دیکھئے عشق میں کیا کیا چیزیں مجھ پہ مہربان ہیں۔

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

کہا گیا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے جو جو نعمتیں دی ہیں ان کا شکر ادا کرنا مشکل ہے۔اسی بات کو شاعر اس شعر میں بیان کر رہا ہے کہ خدا نے کھانے پینے کی کیسی کیسی نعمتیں دی ہیں جس کا ہماری زبان مزے لوٹتی ہے۔اس کے لئے کوئی جس قدر بھی شکر ادا کرے کم ہے۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- خواجہ حیدر علی آتش کی زندگی کے حالات اور ان کے فن کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔
- خواجہ حیدر علی آتش کے عہد اور ہم عصروں سے واقف ہوئے۔

- خواجہ حیدر علی آتش کے کلام کی قدر و قیمت متعین کی۔
- خواجہ حیدر علی آتش کی دو غزلوں کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کیا۔

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. خواجہ حیدر علی آتش کے عہد کے چار بڑے شاعروں کے نام بتائیے۔

2. خواجہ حیدر علی آتش کے کلام کی پانچ خصوصیات بتائیے۔

3. خواجہ حیدر علی آتش نے کس اہم شاعر کی شاگردی اختیار کی؟

4. خواجہ حیدر علی آتش نے کن کن اصناف میں شاعری کی ہے؟

5. خواجہ حیدر علی آتش کے دو اشعار کی تشریح کیجیے؟

8.6 سوالات کے جوابات

1. آتش کے عہد کے چار بڑے شاعرا۔ مصحفی ،۲۔انشاء،۳۔ناسخ ،۴۔رشک۔

2. آتش کے کلام کی خصوصیات: اخلاقی مضامین، تصوف کی چاشنی، مضمون آفرینی، بندش کی صفائی، زبان کی روانی۔

3. آتش شاعری میں مشہور شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے۔

4. آتش ایک صوفی منش شاعر تھے۔ درباروں سے دور رہتے تھے۔ قصیدہ سے لگاؤ نہیں تھا۔ غزلوں میں خوب چمکے۔

5. آتش کے اشعار کی تشریح:

I
یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بے تاب گفتگو کرتے

چمن میں گل اور بلبل ایک عاشق اور معشوق کی طرح رہتے ہیں۔ روایت یہی ہے کہ گل اور بلبل ایک دوسرے پر فریفتہ ہیں۔ گل کو عاشق اور بلبل کو محبوبہ کی طرح جانا گیا ہے۔ اسی روایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے محبوب کو گل کے روبرو کردے اور خود بلبل بے تاب سے گفتگو کرے۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب گل کی طرح خوبصورت ہے۔ جب محبوب اور گل روبرو یعنی ایک دوسرے کے سامنے ہونگے تو یہ دیکھنا بھی دلچسپ ہوگا کہ کون زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف گل کے روبرو محبوب کو دیکھ کر بلبل کو ایک تڑپ ہوگی۔ ایسے میں عاشق اور بلبل دونوں کی گفتگو کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

II
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

یہ خواجہ حیدر علی آتش کا بہت مشہور شعر ہے۔ اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ سکندر اور دارا نام کی دو تاریخی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا سے کیسے کیسے نامی گرامی، کیسے کیسے مشہور لوگوں کا نام و نشاں تک مٹ گیا۔ مثال کے طور پر سکندر اور دارا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ سکندر کہاں دفن ہے؟ اس کا

گور کہاں ہے کسی کو نہیں معلوم جبکہ سکندر فاتح عالم تھا۔اسی طرح دارا کی قبر کا بھی کچھ اتا پتا نہیں ہے۔

8.7 فرہنگ

مہ ومہر	چاندوسورج
مو	بال
طلائی	سونے کا
نقرئی	چاندی کا
اسیر	قیدی
بیاض	سفیدی، کاغذ سادہ
تکمہ	وہ حلقہ جس میں گھنڈی لگائی جائے، گریبان کی گھنڈی
شبگیر	پچھلی رات کا
چرخ	آسمان
عدو	دشمن
برگشتہ	پھرا ہوا، منحرف
طالع	نصیب، قسمت
آتش	آگ
باراں	بارش
دہن	مُنہ
گماں	وہم، خیال، شبہ
ارغواں	ایک ارگن باجا، سرخ اور نارنجی رنگ، ایک سرخ رنگ کا پھول
پیرمغاں	شراب بیچنے والے۔آتش پرستوں کے رہنما
استخواں	ہڈی، گٹھلی
کاہش	کمی ،تنزل
حرماں	نا امیدی، مایوسی، بدقسمتی
مسیحا	جو مردے کو زندہ کردے۔حضرت عیسیٰ کا لقب

8.8 کتب برائے مطالعہ

1۔	مقدمہ کلام آتش	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، یوپی، 1990
2۔	خواجہ حیدر علی آتش	محمد ذاکر	ہندوستانی ادب کے معمار، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1992
3۔	درس بلاغت	شمس الرحمان فاروقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997
4۔	غزل اور درس غزل	اختر انصاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1977
5۔	غزل اور غزل کی تعلیم	اختر انصاری	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، 1995
6۔	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007
7۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	اترپردیش اردو اکادمی لکھنو، یوپی، 2003
8۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY